ڈاکٹر محمد یار گوندل
لیکچرر، شعبہء اُردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

غالب کے بعض بیانات کا تنقیدی جائزہ

Dr. Muhammad Yar Gondal
Lecturer, Department of Urdu, G C Universirty, Sargodha

A Critical review of some statements of Ghalib

Ghalib is the best poet of Urdu.This article belong to some contradict statements of Ghalib.In the whole life of Ghalib,he protected his ego through different ways. So a lot of contradict attitudes are found in his personality and his statements. In this article contradict statements of Ghalib has been analyzed.Some are as i.e abouthisage,creed,sirnames,journerytoCalkhta,Urdupoetry,Kaseeda,Masnvi,prisonment,war of independent,Dastambo, death of Marza Yousaf,religion,pension,advertisement of books with other names.For strengthen his literary personality he made contradicts statments in his life.

غالب کا شوق واماندگی تا دم مرگ پناہیں تراشتا رہا۔ اس کی انا، خود پسندی اور انفرادیت کا اظہار اس کی زندگی میں قدم قدم پر جلوہ گر ہوا ہے۔ وہ اپنی انا کو مجروح ہوتے ہوئے دیکھنا کبھی بھی پسند نہیں کرتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی غالب ایک طرزِ زیست کا نام بھی ہے۔ اُس کی ہزاروں خواہشیں اور معاشی و مادی مسائل ایسے تھے جن کی بنا پر کبھی کبھی اس کو اپنی انا کے پندار کا صنم کدہ ویران بھی کرنا پڑا۔ غم روزگار کے کٹھن لمحوں میں غالب کے ظاہر و باطن میں کہیں کہیں تضاد کی جھلک پائی جاتی ہے لیکن حقیقت میں یہ بھی اُس کی انا کے تحفظ کا ایک وسیلہ ہے۔ غالب ایک عظیم فن کار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دنیا دار انسان بھی تھے۔ ان کی شخصیت میں انا کی سختی کے ساتھ ساتھ عیار طبع خریدار دیکھ کر مصلحت کی لچک بھی پائی جاتی ہے۔ مطلب برآوری کے لیے انہیں بعض اوقات اپنی انا کو پسِ پشت بھی ڈالنا پڑا۔ اصل میں یہ سب کچھ دنیا داری کا تقاضا تھا اور اپنے آپ کو مزید شکست و ریخت سے بچانے کا حربہ تھا۔

غالب کی انانیت میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ اور اعتدال پایا جاتا ہے۔ وہ ایک طرف تو انگریز حکام کے مداح اور بہی خواہ ہیں ۔ اپنے درباری اعزاز میں اضافہ چاہتے ہیں اور ہر چھوٹی بڑی تقریب پر ''صاحبان عالی شان'' کی مدح میں قصیدے لکھتے ہیں۔ دوسری طرف محض اس بات پر دہلی کالج کی پروفیسری قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں کہ ''صاحب سکتر'' اپنی نشست سے ان کی پذیرائی کے لیے کیوں نہیں آئے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

''فی الاصل غالب کی شخصیت میں تضاد یا تصنع کا شائبہ بھی نہیں اور نہ ہی اس کی شخصیت مجروح اور منقسم ہے۔اس کے انکشاف واظہار کی سطحیں البتہ دو ہیں۔ایک وہ ہے جس میں جسم کی مادی ضروریات غالب ہیں ۔دوسری وہ جہاں تخئیل نے مادی ضروریات ہی کو نہیں بلکہ جذبے اور خواہش کی تہ در تہ کیفیات کو بھی ایک لطیف سی صورت عطا کر دی ہے۔مقدم الذکر سے اس کی داستان حیات منسلک ہے اور موخر الذکر سے اس کی داستان شوق۔تصویر ایک ہے لیکن رخ دو ہیں۔''(۱)

یہاں ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ غالب کی نام نہاد ذاتی کمزوریاں ان کے ادبی مقام کے تعین میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔وہ انسان تھا کوئی فرشتہ نہیں۔اس مضمون میں غالب کے بعض ایسے بیانات کا تنقیدی جائزہ لیا جا رہا ہے جن میں انہوں نے اپنی انا کے تحفظ اور مطلب برآوری کی غرض سے مصلحت کوشی سے کام لیا جس کی بنا پر کہیں کہیں ان کے قول وفعل میں تضاد کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔

غالب اپنے حسب ونسب کے بارے میں منشی حبیب اللہ ذکا کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔۔میں قوم کا ترک سلجوتی ہوں،دادا میرا ماوراالنہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا ۔۔۔۔'' (۲)

اسی طرح غالب نے ایک تذکرے کے لیے اپنے حالات لکھے جس میں لکھا:

''اسداللہ خاں عرف ''مرزا نوشہ'' غالب تخلص،قوم کا ترک سلجوتی سلطان برکیارق سلجوتی کی اولاد میں سے ۔۔۔'' (۳)

کلیات نظم فارسی میں غالب کا ایک قطعہ ہے جس کی بیت ۳ یہ ہے:

ایبکم از جماعۂ اتراک درتمامی زماہ دہ چندیم

غالب نے اس کے متعلق حاشیہ میں لکھا ہے: ''ایبک بہزۂ مفتوح وموحدۂ مفتوحی قومی از قوم ترک۔''

اس بارے میں قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

''مجھے یاد آتا ہے کہ حالی نے یادگار غالب میں نیّر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا آغاز ایک ترک لاچین (خسرو) سے ہوا،اور اس کا خاتمہ ایک ترک ایبک (غالب) پر ہوا۔جناب مہر اپنی کتاب غالب (طبع اصدے) میں فرماتے ہیں کہ ''غالب قوم کے ایبک ترک تھے۔'' جناب مالک رام بھی انہیں ایبک ترک سمجھتے ہیں (ذکر غالب طبع اول ۲ص۱۲) میں نے شجرۃ الاتراک وغیرہ میں سے ڈھونڈا،لیکن نہ پایا۔کسی اور جگہ بھی ایبک ترکوں کی کسی قسم یا قبیلے کا نام نہیں ملا۔اپنی تحقیق پر بھروسا نہ کر کے میں استاد ذکی ولیدی طوطان (طوغان) سے ان کے ورود پٹنہ کے وقت اس کے متعلق دریافت کیا،انہوں نے جواب دیا کہ آئی بمعنی ماہ ہے اور بک بمعنی امیر ہے،یہ لقب ہے،ترکوں کی کسی قسم یا قبیلے کا نام نہیں۔غالب پر تعجب نہیں حیرت اس پر ہے کہ نیّر جو علم الانساب کے ماہر سمجھے جاتے ہیں،ایسی بات کیوں کہی۔''(۴)

اسی مذکورہ شعر کے ضمن میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں اپنی کتاب ''غالب اور آہنگ غالب'' میں لکھتے ہیں:

''غالب نے کئی جگہ اپنے کو ایبک ترک کہا ہے۔ ایبک کسی ترکی قبیلے کا نام نہیں ہے۔ غالباً اِس ان کی مراد ازبک ہے، جو بدخشاں میں آباد تھے اور اب بھی آباد ہیں۔ اگر غالب کا یہ بیان صحیح ہے کہ ان کے اجداد سمرقند کے رہنے والے تھے اور کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے تو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ازبک تھے۔ اگرچہ سمرقند شہر میں تاجک لوگ بڑی تعداد میں سامانیوں کے زمانے سے آباد ہیں لیکن نواح کی آبادی اُزبکوں پر مشتمل ہے جو وہاں صدیوں سے رہتے سہتے ہیں۔ اگر غالب کے اجداد کھیتی باڑی کرتے تھے تو ظاہر ہے کہ شہر کے نواح ہی میں کرتے ہوں گے۔ شہر کے بیچوں بیچ تو کھیتی باڑی نہیں ہوسکتی۔ ان حالات میں قیاس ہوتا ہے کہ غالب کے اجداد سمرقند کے نواح کے کاشت کرنے والے ازبک ہوں گے۔ سمرقند جہاں سے ان کے اجداد کا تعلق تھا، اور بدخشاں جہاں سے ان کے دادا قوقان بیگ خان آئے تھے دونوں جگہ ترکی بولنے والی آبادی اُزبکوں کی ہے۔''(۵)

خود غالب نے بھی لکھا ہے کہ ان کے دادا قوقان بیگ خان کی زبان ترکی تھی۔ اس سے ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے مذکورہ بالا بیان کو مزید تقویت ملتی ہے کہ غالب ایبک ترک نہیں تھے۔ غالب کے حسب ونسب پر بات کرتے ہوئے کالی داس گپتا بھی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ :

''غالب ترکی نژاد تھے۔۔۔ اگرچہ غالب نے لکھا ہے تاہم وہ ایبک ترک نہیں ہوسکتے کیوں کہ ترکوں میں یہ قبیلہ ہے ہی نہیں۔ شاید ازبک ہوں گے۔''(۶)

غالب نے خود کہا ہے:

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری　　کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

لیکن اس شعر کو دوسرے تناظر میں بھی دیکھا جاسکتا ہے جب غالب کی شاعری پر اعتراضات ہو رہے تھے اور انھیں یہ بھی کہنا پڑا کہ:

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

کلیات نظم فارسی کے مذکورہ بالا قطعے کی بیت چہارم یہ ہے :

فن آبائے ما کشاورزی ست　　مرزباں زادۂ سمرقندیم

یعنی مرے بزرگوں کا پیشہ کھیتی باڑی ہے۔ اس ضمن میں کالی داس گپتا لکھتے ہیں:

''جب صرف دو پشت پہلے ان کے بزرگ کھیتی باڑی کرتے تھے تو سو پشت سے اپنے آبا و اجداد کو سپاہی کہنا محض تعلّی ہے۔''(۷)

اصل میں مذکورہ بالا شعر کا پس منظر غالب کی ذوق سے معاصرانہ چشمک سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں غالب نے اپنے فن کو بھی انا کی بھینٹ چڑھانے سے گریز نہیں کیا اور ''پیشۂ آبا'' کو اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے برتر گردانا ہے۔ غالب نے منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو خط میں اپنے باپ کے بارے میں لکھا:

''۔۔۔۔باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنو جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔۔۔۔''(۸)

لیکن غالب کا یہ بیان بھی درست نہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:

''غالب کا بیان ہے کہ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں حیدر آباد میں تین چار سو کی جمعیت سے ملازم تھے، لیکن ان کا یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ واضح رہے کہ نظام علی خاں کے زمانے میں جن کو یہ منصب حاصل تھا ،ان کے تمام تر کاغذات دفتر دیوانی (موجودہ آندھرا پردیش آرکایوز) میں محفوظ ہیں۔ میں نے خاص کر ان کاغذات کو دیکھا لیکن ان میں مرزا عبداللہ بیگ خاں کے متعلق کوئی کاغذ موجود نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں غالب نے اپنے چچا نصر اللہ بیگ خاں اور اپنے والد کی جمعیت کو گڈمڈ کر دیا۔۔۔ چونکہ نظام علی خاں کے منصب داروں کی فہرست میں ان کا نام نہیں ہے۔ اس لیے یہ بات واضح ہے کہ وہ حیدر آباد میں بہت معمولی حیثیت کے کارگزار رہے ہوں گے۔''(۹)

غالب نے اپنے چچا کی وفات کے حوالے سے اپنی عمر کہیں کچھ لکھی ہے اور کہیں کچھ۔ مثلاً انہوں نے ۱۵ فروری ۱۸۶۷ء کو منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھا:

''۔۔۔۔پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا۔ آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا۔۔۔''(۱۰)

اسی طرح غالب نے اپنی پنشن کے مقدمے کے عرضی دعوے مورخہ ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء میں لکھا:

''۔۔۔ (چچا کی وفات) کے وقت میری عمر نو برس تھی اور میرے بھائی کی سات، میری دادی ستر برس کو پہنچ چکی تھیں۔۔۔''(۱۱)

پنج آہنگ میں شامل ایک خط جو غالب نے ۱۴ اگست ۱۸۴۹ء کو سراج الدین احمد کو لکھا کہ نصر اللہ بیگ خاں اپنے بڑے بھائی کے انتقال کے کم و بیش پانچ سال بعد چل بسے۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے اپنے مرتب کردہ دیوان غالب کے دیباچے میں پنج آہنگ کے حوالے سے ایک فارسی خط نقل کیا ہے جس میں غالب نے قاضی محمد صادق خاں اختر صاحبِ تذکرہ آفتاب عالم تاب کو تفصیل سے اپنی زندگی کے حالات تحریر کئے ہیں۔ اس خط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نصر اللہ بیگ خاں کے انتقال کے وقت غالب کی عمر دس سال تھی۔ لکھتے ہیں:

''چوں پنج سال از عمر من گزشت، پدر از سرم سایہ برگرفت عم من نصر اللہ بیگ خاں چوں خواست کہ مرا نیاز پرورد، ناگاہ مرگش فراز آمد کما بیش پنج سال پس از گزشتن برادر پی مہین برادر برداشت و مرا دریں خرابہ جا تنہا گزاشت ''(۱۲)

ان بیانات سے مترشح ہے کہ غالب وقتی مصلحتوں کے تحت اپنے چچا کے انتقال کے حوالے سے اپنی عمر میں کمی بیشی کرتے رہے۔ نصر اللہ بیگ خاں کی وفات اواخر ۱۸۰۵ء سے اوائل ۱۸۰۶ء میں ہوئی۔ اس سے ان کی وفات کے وقت غالب کی عمر دس سال ہونا درست نہیں۔ غالب کی تاریخ پیدائش کے حساب سے چچا کے انتقال کے وقت آٹھ سال اور کچھ مہینے بنتی ہے۔

غالب نے اپنے تخلص اختیار کرنے کے حوالے سے بھی متضاد بیانات دیئے ہیں۔انہوں نے اپنے تخلص کے بارے میں منشی شیو نرائن آرام کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

''میں نے تو کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلص رکھا ہے ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں۔'' (۱۳)

لیکن اس بارے میں مولانا امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

''لیکن دو چار برس صحیح تخمینہ نہیں۔کیوں کہ وہ اپنی شعر گوئی کی پہلی منزل 'بیدل رنگ' کے زمانے میں 'اسد' ہی لکھتے رہے ہیں۔البتہ فارسی میں سرے سے 'غالب' ہی تخلص استعمال کیا ہے، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انھوں نے فارسی کے لیے یہ تخلص پسند کیا تھا، بعد میں ریختے کے اندر بھی لکھنے لگے'' (۱۴)

نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور کے تذکرے ''عمدہ منتخبہ'' میں غالب کا ذکر اسد تخلص کے تحت آیا ہے۔بقول ڈاکٹر گیان چند:

''اس تذکرے کی ابتدا ۱۲۱۶ھ سے ہوئی اور ۱۲۳۱ھ تک اس میں اضافے ہوتے رہے۔'' (۱۵)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب اٹھارہ انیس برس کی عمر میں ''اسد'' تخلص سے مشہور تھے۔حتیٰ کہ غالب نے اپنی پختہ عمر کی شاعری میں گاہے گاہے اسد تخلص استعمال کیا ہے۔اس بارے میں ڈاکٹر سید عبداللطیف لکھتے ہیں:

''لیکن اس (غالب) کے اردو دیوان سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی۔اس کے لیے اس حصہ کلام کو ملاحظہ کیجئے جو پختہ عمر ۱۸۲۳ء تا ۱۸۵۵ء میں موزوں ہوا۔اس میں آپ کو کئی غزلیں ملیں گی جن میں اسد تخلص کیا گیا ہے۔'' (۱۶)

حقیقت یہ ہے کہ غالب نے ابتدائی دو چار برس ہی اسد تخلص استعمال نہیں کیا بلکہ بعد میں بھی شعری ضروریات کے تحت اسد تخلص استعمال کرتے رہے ہیں۔غالب کی دو چار برس اسد تخلص کی بات کے پس منظر میں کلکتہ میں مخالفین کے اعتراضات کا جواب بھی موجود ہے۔کیوں کہ کلکتے میں غالب پر یہ اعتراض بھی کیا تھا کہ یہ شخص دو تخلص رکھتا ہے لہذا اس شخص کے بیان کی صداقت مشکوک ہو سکتی ہے۔اسی بنا پر غالب نے اپنے تخلص کی وضاحت اس موقع پر بھی کی تھی۔اس حوالے سے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''یہ امر مخفی نہ رہے کہ جب مجھ غالب خاکسار کا ستارۂ بدبختی کلکتہ پہنچا تو ستم گران وطن میں ایک بدطنیت نے جو مجھ سے پیش تر ہی اس جگہ۔۔۔(قیاسی: موجود تھا) اور جو ارکان عدالت سے شناسائی کا دم بھرتا تھا، یہ مشہور کر دیا کہ اس رنجور نے، کہ دہلی سے وارد ہوا ہے، نہ صرف اپنا نام، بلکہ تخلص بھی بدل ڈالا ہے، (چناچہ) صاحبان بارگاہ کو دفتر کدے کے حاکم کے سامنے اس بے حیثیت کا نام پیش کرنے میں تامل ہوا۔ناچار میں نے اپنا اردو غزل کا دیوان، جس کی تالیف کو سات سال سے بھی زیادہ ہو چکے تھے اور جس پر اس روسیاہ کی مہروں میں سے ایک مہر تھی، ''اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ'' مع ''۱۲۳۱ ہجری''۔۔۔دفتر کدے کے حاکم اعلا کے پاس بطور شہادت بھجوا دیا۔۔۔بے شک وہ مہر بھی اس ہنگامے کے لیے لوح ذو جہتین ہے اور اس بحث میں تیغ دو دم کا حکم رکھتی ہے۔چونکہ جس طرح وہ نیا نام رکھ لینے کے دعوے کی تکذیب میں مدعی کا منہ بند کر دیتی ہے، (اسی طرح) میرے اصلی نام کے تسلیم نہ کرنے میں مجھ گمنام کے سکوت کے لیے کافی ہے۔یقیناً

اس فقیر کا نام اسد اللہ خان ہے اور عرفیت مرزا نوشہ اور تخلص غالب، لیکن ''غالب'' چوں کہ چہار حرفی لفظ ہے اور بعض بحروں میں وزن میں نہیں آتا، (اس لیے) فقیر لفظ ''اسد'' کو، جو گناہ گار کے نام کا مخفف اور ساتھ ہی سہ حرفی لفظ ہے، کبھی کبھی بطور تخلص استعمال کرتا ہے۔ اگر چہ یہ غلطی ہے تو معاف کی جائے، اور اگر جائز ہے تو انصاف کیا جائے۔'' (۱۷)

سفر کلکتہ غالب کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ وہ کلکتہ جانے سے پہلے فیروز پور گئے اور وہیں سے سفر کلکتہ پر روانہ ہو گئے۔ اس بارے میں وہ خود پنشن کی عرضی مورخہ ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء میں لکھتے ہیں:

''اب بارشیں ختم ہو چکی تھیں اور نواب گورنر جنرل بہادر بھی کلکتہ مراجعت فرما چکے تھے۔ میں فیروز پور سے تو دلی جا نہیں سکا تھا اب باندہ سے کیسے اور کیوں کر اس کی جرأت کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ آخر دلی اور کلکتہ میں دونوں جگہ قانون تو وہی ہے مجھے سارا معاملہ حکومت کے انصاف پر چھوڑ دینا چاہیے۔'' (۱۸)

غالب کے اس بیان پر مالک رام لکھتے ہیں:

''اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک مرتبہ جو دلی سے نکلے تو پھر فیروز پور، کان پور، لکھنو اور باندہ میں کوئی سال بھر کے قیام کے بعد سیدھے کلکتے چلے گئے۔ کلیات نثر غالب (ص ۶۳۔۶۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب سفر پر روانہ ہوئے تو چونکہ روانگی سے پہلے مولوی فضل حق خیر آبادی سے الوداعی ملاقات نہیں کر سکے تھے۔ اس لئے ان سے ملنے کو دلی واپس گئے اور پھر دوبارہ سفر پر روانہ ہوئے۔ کلیات کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔ درخواست میں انھوں نے اختصار سے کام لیا اور اس کا ذکر مناسب خیال نہیں کیا۔'' (۱۹)

اسی مذکورہ بالا عرضی میں غالب نے لکھا ہے کہ ایک بار جو وہ دہلی سے فیروز پور کے لیے نکلے تو قرض خواہوں کے خوف کی وجہ سے دہلی واپس نہ جا سکے۔ اس کی توجیح ڈاکٹر ابو محمد سحر یوں کرتے ہیں:

''درخواست کے مفصل بیانات کی عدم صحت پر مقدمہ بازی کی مصلحتوں کے پیش نظر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کلکتے پہنچتے ہی غالب کو یہ احساس دلایا جا چکا تھا کہ ان کو اپنا مقدمہ پہلے دہلی کے رزیڈنٹ کے سامنے پیش کرنا چاہیے تھا۔ رائے جھجھ مل کے نام کلکتے سے اپنے پہلے ہی خط میں انہوں نے یہ استفسار کیا تھا:

''اگر بندہ را در پیچ و خم استغاثہ بداں افتد کہ در دار الخلافت وکیلی از جانب خود قرار باید داد صاحب این زحمت گوارا خواہند کرد یا نے۔ ہر چہ در این مادہ مضمرِ ضمیر باشد بے تکلف باید نوشت''

چنانچہ انہوں نے اپنی درخواست میں سب سے زیادہ زور اسی پر صرف کیا ہے کہ دہلی میں رہنا ان کے لیے دوبھر ہو گیا تھا اور وہ وہاں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ تھے۔ اسی وجہ سے وہ فیروز پور سے بالارادہ کلکتے روانہ ہونے کے بجائے سر چارلس مٹکاف سے ملاقات کی جستجو میں سیدھے کان پور پہنچے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ کان پور سے ان کی معیت میں دہلی واپس آئیں گے اور کسی مناسب موقعے پر ان سے اپنا احوال بیان کریں گے لیکن

کان پور پہنچتے ہی وہ بیمار پڑ گئے اور انھیں اپنے علاج کی غرض سے لکھنو جانا پڑا۔'' (۲۰)

اصل میں درخواست میں تاویلات کا مقصد گورنر جنرل کو یہ باور کرانا تھا کہ دہلی میں چارہ جوئی کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا اور وہ بڑی مشکلوں سے کلکتے پہنچے تھے تا کہ کلکتہ کے حکام، مقامی حکام (دہلی) کو نظر انداز کر کے ان کی درخواست پر ہمدردانہ غور کریں۔ غالب نے 'خاتمۂ گلِ رعنا' میں بھی لکھا ہے کہ وہ فیروز پور سے دہلی واپس آئے تھے۔ کیونکہ جلدی میں وہ مولوی فضل حق کی اجازت کے بغیر ہی فیروز پور روانہ ہو گئے۔ منزل پر پہنچ کر انہوں نے مولوی فضل حق کو صنعت تعطیل میں ایک خط لکھا۔ فیروز پور میں ان کا مقصد حاصل نہ ہوا تو وہ دہلی واپس آ گئے۔ اس کے ایک عرصے بعد انہیں دوبارہ سفر کا خیال آیا۔ لہذا فیروز پور سے دہلی واپس آنے کے تقریباً پانچ ماہ بعد وہ کلکتے کے سفر پر روانہ ہوئے۔

قیام لکھنو کے بارے میں حالی نے لکھا ہے کہ:

''جب مرزا نے دلی سے کلکتے جانے کا ارادہ کیا تھا، اس وقت راہ میں ٹھہرنے کا قصد نہ تھا، مگر چوں کہ لکھنو کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنو آئیں اس لیے کان پور پہنچ کر ان کو خیال آیا کہ لکھنو بھی دیکھتے چلیے۔'' (۲۱)

لیکن دوسری طرف غالب لکھتے ہیں کہ:

''اتفاق دیکھیے کہ کان پور پہنچتے ہی میں بیمار پڑ گیا۔ اچانک نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہلنے جلنے کی طاقت بھی جاتی رہی چوں کہ مجھے اس شہر میں کوئی مناسب طبیب نہ مل سکا۔ اس لئے مجبوراً دریائے گنگا کو عبور کر کے کرائے کی ایک فینس مجھے لکھنو کی راہ لینی پڑی۔ میں لکھنؤ میں پانچ مہینے اور چند روز صاحبِ فراش رہا۔'' (۲۲)

مالک رام نے لکھا ہے کہ غالب کے سفر کی تفصیل سے حالی کا یہ بیان محل نظر ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مالک رام، آغا میر سے ملاقات کے حوالے سے غالب کے ایک فارسی قصیدے کی نشان دہی کرتے ہیں جو وہ نذر کے طور پر پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''کلیات نظم فارسی کا قصیدہ (۴۹) جس کا مطلع ہے:

گر بہ سنبل کدۂ روضہ رضواں رفتم ہوس زلف ترا سلسلہء جنباں رفتم

جیسا کہ اس کی ردیف ہی سے ظاہر ہے، اسی سفر کے دوران میں لکھا گیا تھا۔ اس کی تشبیب میں متعدد شعر ایسے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اسے انھوں نے دلی سے روانہ ہوتے ہی شروع کر دیا تھا۔ مثلاً:

چہرہ اندودہ بگرد و مژہ آغشتہ بخوں خود گواہم کہ ز دہلی بچہ عنوان رفتم

۔۔۔ آگے چل کر لکھنو پہنچے کا ذکر کرتے ہیں:

لکھنؤ دامِ نشاطے سرِ راہم گسترد بیخود از ولولۂ شوق، پُر افشاں رفتم

یقین ہے کہ انھوں نے یہ قصیدہ غازی الدین حیدر اور آغا میر کی خدمت میں پیش کرنے کو لکھنا شروع کیا تھا۔ آغا میر سے ملاقات کی تجویز پیش ہوئی، تو غالباً یہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ملاقات کا جو وقت مقرر ہوا تھا، وہ اتنا تنگ تھا کہ وہ اسے مکمل بھی نہیں کر سکتے تھے۔'' (۲۳)

مالک رام کے اس بیان کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا محض بیماری اور ''ڈھنگ کا معالج نہ ملنے'' پر لکھنؤ جانا محلِ نظر ٹھہرتا ہے۔قصیدے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سفرِ کلکتہ پر نکلتے وقت قیام لکھنو بھی ان کے ذہن میں تھا۔اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالی کا مذکورہ بیان بھی کسی حد تک حقیقت پر مبنی ٹھہرتا ہے۔حالی اور مالک رام کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں غالب غازی الدین حیدر اور آغا میر سے ملاقات کے خواہاں تھے۔اگر واقعی ہی صورت حال ایسی تھی تو غالب کا اپنا بیان مشکوک ہو جاتا ہے۔معلوم ایسے ہوتا ہے کہ غالب اس سبکی کو چھپانے کی کوشش کرتے رہے ہیں جو آغا میر سے مانعِ ملاقات کی بنا پر پیش آئی تھی۔غالب نے مذکورہ بالا خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ میں لکھنؤ میں پانچ مہینے اور چند روز صاحب فراش رہا، درست نہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

> ''اگر ہم غالب کے اس بیان کو درست مان لیں کہ لکھنؤ میں ان کا قیام پانچ مہینے یا پانچ مہینے سے دو چار دن زیادہ رہا تو غالب کو دسمبر ۱۸۲۶ء یا جنوری ۱۸۲۷ء میں لکھنؤ پہنچنا چاہیے مگر یہ تاریخیں تسلیم کرنے میں قباحت یہ ہے کہ ۲۰ نومبر ۱۸۲۶ء (شاہ اودھ اور گورنر جنرل کان پور میں ملاقات کی تاریخ) کو غالب لکھنؤ میں تھے۔اگر ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ غالب نومبر کے مہینے میں لکھنؤ پہنچ چکے تھے تو لکھنؤ میں غالب کے قیام کو کم سے کم آٹھ مہینے ہو جاتے ہیں۔امکان یہ ہے کہ وہ نومبر سے ایک دو مہینے پہلے پہنچے ہوں گے۔اگر ہمارا قیاس درست ہے تو غالب پانچ مہینے سے آٹھ نو مہینے تک لکھنؤ میں رہے تھے۔اس کا بھی امکان ہے کہ ان کا قیام اور بھی زیادہ مدت کے لیے رہا ہو۔'' (۲۴)

غالب نے جس طرح پنشن کی درخواست میں مصلحتہً کلکتے کے سفر سے پہلے فیروز پور سے دہلی آنے کا ذکر نہیں کیا اسی طرح ان کا یہ بیان کہ وہ لکھنو میں پانچ ماہ سے کچھ اوپر مقیم رہے کسی مصلحت پر مبنی ہے۔یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ غالب لکھنؤ جانے کے کچھ عرصہ بعد بیمار ہوئے ہوں تو انہوں نے خط میں صرف اپنی بیماری کا دورانیہ پانچ ماہ ظاہر کیا ہو۔سر دست یہ محض قیاس کی حد تک کہا جا سکتا ہے۔

غالب جب لکھنو سے سفر کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے تو چلہ تارا پہنچ کر ان کو خیال آیا کہ:

> ''بنارس میں قیام کرنے کی بجائے الہ آباد پہنچ کر چند دن آرام کر کے اور سفر کی ضروریات بہم کر کے سفر پر روانہ ہو جاؤں اور سوائے مرشد آباد بنگال کے کسی جگہ قیام نہ کروں۔۔۔بدھ کے روز، دوپہر کے وقت نا خدا کی جگہ خدا پر بھروسا کر کے کشتی میں سوار ہو گیا۔'' (۲۵)

لیکن الہ آباد غالب کو راس نہیں آیا اور وہاں ان کا قیام صرف ایک دن رہا۔اس بارے میں غالب لکھتے ہیں:

> ''افسوس الہ آباد! اس ویرانے پر خدا کی لعنت برسے کہ وہاں نہ تو بیمار کے لیے دوا ملتی ہے اور نہ کسی مہذب انسان کی ضرورت کی کوئی چیز دستیاب ہوتی ہے۔۔۔اس کے لوگوں میں نہیں اور محبت و حیا وہاں کے پیر و جواں میں نایاب ہے۔اس کے نواح و اطراف دنیا کے لیے سرمایہ روسیاہی اور اس کی ویران آبادی۔۔۔دو منزلہ۔۔اس ہولناک وادی کو شہر کہنا سراسر ناانصافی ہے اور اس بھوتوں کی بستی میں کسی انسان کا رہنا کیسی بے حیائی ہے۔'' (۲۶)

مالک رام نے غالب کے ادبی معرکے کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

غالب کے ایک فارسی قصیدے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس سفر میں دو ہنگامے پیش آئے۔ پہلا الہ آباد میں ،دوسرا کلکتے میں۔الہ آباد والے قضیے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔(حاشیے میں مالک رام نے اس شعر کی طرف اشارہ کیا ہے جو کلیات نظم فارسی کے قصیدہ نہم درمنقبتِ سیدالشہد اعلیہ السلام میں شامل ہے:

نفس بلرزہ ز بادِ نہیبِ کلکتہ　　　　نگاہ خیرہ ز ہنگامہ الہٰ آباد　(۲۷)

اس ضمن میں قاضی عبدالودود مالک رام کی کتاب ''ذکر غالب'' پر تبصرہ کرتے ہوئے اس شعر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''غالب کے اس شعر کی بنا پر (مالک رام) نے لکھا ہے کہ سفر کلکتہ میں غالب کے خلاف ایک ہنگامہ الہ آباد میں بھی ہوا تھا۔ مجھے شبہ ہے کہ اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح غلام امام شہید سے تھا۔ میں اس وقت تک یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ ''ہنگامہ الہ آباد'' سے غالب کی کیا مراد ہے لیکن یہ شعر کلیات فارسی طبع اول میں موجود ہے۔'' (۲۸)

خلیق انجم اس موضوع پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''غالب جس دن الہ آباد پہنچے تھے ممکن ہے اسی دن کوئی ادبی محفل منعقد ہوئی اور اس محفل میں غلام امام شہید شریک ہوئے ہوں۔شہید قتیل کے شاگرد تھے۔ممکن ہے غالب کی شہید یا کسی اور سے تلخ کلامی ہوگئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس تلخ کلامی میں شہید نے قتیل کی تعریف کی ہو یا ان کے اشعار سند کے طور پر پیش کیے ہوں۔لیکن یہ سب میرا قیاس ہے۔اس کے لیے شواہد موجود نہیں۔'' (۲۹)

ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے اپنے مقالے ''غالب اور سر سید احمد خاں'' میں ایک فارسی خط نقل کیا ہے کہ جس زمانے میں (۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۶ء) میں سر سید احمد خاں فتح پوری سکیری میں منصف تھے۔انھوں نے مرزا غالب کو ایک خط لکھا تھا جس میں غلام امام شہید کے دو اشعار بھیجے تھے کہ ان کو تضمین کر دیا جائے۔یہ بات غالب کی طبع نازک پر سخت گراں گزری۔وہ قتیل کے شاگرد کو کب اس مرتبے کا سمجھتے تھے کہ ان کے اشعار کی تضمین کریں۔اس سلسلے میں غالب نے جو خط سر سید احمد خاں کو لکھا ہے۔وہ ملاحظہ ہو:

''بنام جوادالدولہ سید احمد خاں بہادر منصف فتح پور

نواب معلیٰ القاب وسید عالی جناب سلامت،

بعد رسیدن منشور رافت نشاں شادماں شدم واز اں چہ مرا بسر انجام آں فرماں دادہ اند غمیں، یک دو بیت از دیگرے گرفتن و برآں گفتار دو چار بیت از خویش افزودن کدام آئین سخن وری وکدام شیوۂ معنی پروری است۔خاصۃً ایں دو بیت کہ جز شکوہ الفاظ تازی ہیچگو نہ معنی نازک ندارد دوسیما در بحرے واقع شدہ کہ ہیچ کس از ایرانیاں دراں بحر غزل نگفتہ،انچہ بریں دو بیت افزانید خواہی آں را مسدس نام نہند وخواہی ترجیع بند خوانند ،خاص از بہر آنست کہ گدایاں یاد گیرند و بر در ہا باہنگ حزیں بخوانند۔کدام عاشق خاتم المرسلین بسماع ایں اشعار از خود رود وگریاں ورد۔حاشا ثم حاشا مخدومی مولوی غلام امام شہید سلمہا اللہ تعالیٰ ہر چہ گفتہ اند وخوشتر ازیں نتواں گفت،لیکن ایں شاعری وسخن پروری نیست،چیزے دیگر ہست کہ در مجلس مولود شریف تواں خواند

۔۔۔اس خط کے تیور بتاتے ہیں کہ سرسید احمد خاں کی یہ فرمائش غالب کی طبع نازک پر گراں گزری۔'' (۳۰)

خلیق انجم نے محمد علی خاں کے نام غالب کے خط کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ:

''اس میں یہ فقرہ خاص طور پر قابل غور ہے۔ غالب نے لکھا ہے کہ الہ آباد میں ''شائستہ مردم بزم'' بھی نہیں ہیں۔ ان الفاظ کا بظاہر یہ مطلب نکلتا ہے کہ الہ آباد میں ایسے لوگ نہیں جو محفل میں شریک ہونے کے قابل ہوں۔ یہ بات تو اس وقت کہی جاسکتی ہے، جب الہ آباد کی کسی محفل میں غالب کے ساتھ کسی کا رویہ غیر شائستہ یا غیر مہذب رہا ہو۔'' (۳۱)

مذکورہ بالا بحث سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہنگامہ کلکتہ کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی غالب قتیل سے نفرت کرتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نفرت کی ابتدا الہ آباد ہی سے ہوئی ہو اور اس کا سبب مولوی امام شہید ہو۔ غالب کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں یقیناً ناگوار فضا قائم ہوئی ہوگی جس کی بنا پر انہوں نے الہ آباد میں طویل قیام کی خواہش کو ترک کر دیا اور وہاں سے جلد آگے سفر پر روانہ ہو گئے۔

کلکتہ کے مشاعروں کے ضمن میں سفیر ہرات کے بارے میں بھی غالب کے متضاد بیانات ملتے ہیں۔ کہیں اس کی حاضری پہلے مشاعرے میں ہے، کہیں دوسرے اور کہیں وہ کسی مشاعرے میں بھی حاضر نہیں ہوئے۔ ایک جگہ غالب لکھتے ہیں:

''یہاں کی اہم خبروں میں سے یہ ہے کہ اس شہر کے سخن سنجوں اور نکتہ رسوں نے فدوی کے یہاں پہنچنے کے بعد ایک بزمِ سخن مرتب کی تھی کہ ہر انگریزی مہینے کی پہلی اتوار کو سارے شعراء اور سخن فہم حضرات سرکار کمپنی کے مدرسے میں جمع ہوتے اور غزلیں پڑھتے اور سنتے تھے۔ اتفاقاً بادشاہِ ہرات کا ایک سفیر بھی، خدا اس کو آفات سے محفوظ رکھے، جو یہاں آیا ہوا ہے، اس محفل میں آ پہنچا اور اس جاے عالی نے فارسی گویوں کے اشعار سنے۔ میری اس نے بڑی شدومد سے تعریف کی، اور کہا کہ اس کلام کی قدر ہندوستان میں کون کر سکے گا۔ آپ کا کلام تو اس لائق تھا کہ فصحائے ایران سنتے اور سر دھنتے۔ پھر اس نے حاضرین کی طرف رخ کر کے کہا، دوستو، یہ ایک شخص تم لوگوں میں غنیمت ہے اور شعر و شاعری سے قطعِ نظر زبان فارسی کا عالم ہے۔'' (۳۲)

کلکتہ کے مشاعرے میں جب غالب پر اعتراضات ہوئے تو غالب نے ان اعتراضات کے جواب دینے کی ٹھان لی اور مشاعرے کی تیسری نشست میں انہوں نے جواب دیے۔ اس بارے میں گفتگو کرتے ہوئے غالب نے ایک خط میں لکھا ہے کہ:

''۔۔۔قدرت نے اپنا انتظام (پہلے سے) کر رکھا تھا اور حق اہلِ حق کی حمایت کے لیے بڑے اچھے انداز میں ظاہر ہوا، یعنی اُن دنوں میں خاصانِ عجم میں سے ایک مقتدر شخص، جو سفارت پر ایران سے آیا ہوا تھا، بانیانِ مشاعرہ کی دعوت پر اس محفل میں موجود تھا۔ اس ان سب لوگوں کے اشعار سنے اور جب میری باری آئی تو باوجود عدمِ تعارف کے اس کی ساری توجہ میری طرف ہوگئی اور اس نے میرے لیے اپنے اشتیاق کا اظہار کیا۔ شاید ان ایرانیوں نے، جو اس سے پیش تر کلکتے میں تھے، اس کے سامنے میری نغز گوئی کی تعریف کی ہو۔ جب اس نے میرا کلام سنا اور اسے میرا تخلص معلوم ہوا۔ کہنے لگا، تیرے کلام میں بہت زور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تو سب لوگوں پر غالب ہے اور اسمِ بامسمّیٰ ہے۔ یہ کہہ کر اس نے اہل بزم کی طرف رخ کیا اور کہا، دوستو تم

لوگوں کے درمیان یہ نفس گداختہ اور خونیں نوا غنیمت ہے۔اس شخص کی قدر کرو کہ شعروشاعری سے قطعِ نظر یہ (شخص) فارسی زبان کا عالم (بھی) ہے۔یہ گفتگو کرتے ہوئے میرے نطق کا گھوڑا بدکا اور اس نے میدان حق جوئی میں فتنے کی گردن اڑادی۔میں نے جب اعتراضات کا جواب دینے کو زبان کھولی تو سفیر مذکور میرا ہم زبان ہوگیا اور اس نے میری توصیف کرنا اور ان لوگوں پر ہنسنا شروع کردیا۔۔۔''(۳۳)

خلیق انجم لکھتے ہیں کہ غالب نے سفیر ہرات سے اپنے متعلق جو توصیفی اور تعریفی کلمات منسوب کیے ہیں ان کے مطائے سے سید لطیف الرحمٰن کا اس نتیجے پر پہنچنا غلط نہیں تھا۔وہ غالب کے بارے میں سفیر ہرات کے تاثرات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''غالب نے اپنے اور دوسرے شعرائے ہند کے بارے میں کفایت خاں کے تاثرات کو جس مبالغہ آرائی کے ساتھ بیان کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کفایت خانی تاثرات غالب صاحب کی ذہنی تخلیقات ہیں اور خود کفایت خاں عبدالصمد نمبر۲ ہے اس فقرے سے کہ ''یہ شخص پارسی زبان کا عالم ہے، تخلیق کا راز فاش ہوجاتا ہے۔''(۳۴)

اس ضمن میں خلیق انجم نے لکھا ہے کہ غالب نے تین مشاعروں میں سے کم سے کم ایک مشاعرے میں سفیر ہرات کی موجودگی بتائی ہے۔مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام خط میں غالب لکھتے ہیں:

''قضارا اس زمانے میں شہزادہ کامران درانی کا سفیر گورنمنٹ میں آیا تھا۔کفایت خاں اس کا نام تھا۔اس تک یہ قصہ پہنچا۔اس نے اساتذہ کے اشعار پانچ سات ایسے پڑھے۔۔۔'' (۳۵)

غالب کے اس بیان سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ سفیر ہرات کسی بھی مشاعرے میں شریک نہیں ہوئے بلکہ کسی اور شخص نے ان کو یہ قصہ سنایا تھا۔خلیق انجم لکھتے ہیں کہ میں نے سفیر ہرات کے بارے میں بہت تحقیق کی لیکن ان کے بارے میں کچھ بھی معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔میرا شبہ یقین میں بدل گیا کہ سفیر ہرات بھی عبدالصمد کی طرح غالب کی تخلیق ہیں۔لکھتے ہیں کہ:

''میں سید اکبر علی ترمذی صاحب کا شکر گزار ہوں، جنہوں نے نیشنل آرکائیوز دھلی میں محفوظ دو دستاویزوں کے حوالے سے بتایا کہ سفیرِ ہرات کا پورا نام سید حسین علی خاں معروف بہ کفایت خاں، وکیل والئی ہرات تھا اور وہ کلکتے میں گورنر جنرل کے ۱۶ جولائی کے دربار میں موجود تھے۔''(۳۶)

اس موضوع کو سمیٹتے ہوئے خلیق انجم لکھتے ہیں:

''غالب نے ادبی معرکے سے متعلق کسی ایک مشاعرے میں سفیر ہرات کی موجودگی کی تفصیل بیان کی ہے۔ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ادبی معرکے کے پہلے مشاعرے میں سفیر ہرات شریک تھے اور کہیں پتا چلتا ہے کہ وہ تیسرے مشاعرے میں موجود تھے۔دل چسپ بات یہ ہے کہ اس معرکے اڑتیس سال بعد غالب نے مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ سفیر ہرات مشاعرے میں شریک نہیں تھے بلکہ کسی نے انھیں اس معرکے کی تفصیل بیان کی تھی۔سفیر ہرات نے سند کے طور پر پانچ سات اشعار پڑھے جو بقول غالب ''قاطع برہان'' میں مندرج ہیں''(۳۷)

غالب فن تاریخ گوئی میں اپنے آپ کو ''بیگانہ محض'' سمجھتے تھے اور اس کا اظہار دوستوں سے خطوط کے ذریعے کرتے رہے ہیں لیکن دوسری طرف فن تاریخ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار خطوط کے ذریعے بھی کرتے رہے ہیں۔خطوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ کسی طرح تاریخیں برآمد کرتے رہے ہیں۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ انہیں اس فن سے کتنا لگاؤ تھا۔غالب میاں دادخاں سیاح کو لکھتے ہیں:

''تمھاری جان کی قسم کہ میں فن تاریخ گوئی و معما سے بیگانۂ محض ہوں۔اردو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سنی ہوگی۔فارسی دیوان میں دو چار تاریخیں ہیں۔ان کا یہ حال ہے کہ مادہ اوروں کا ہے اور اشعار میرے ہیں۔تم سمجھے کہ میں کیا کہتا ہوں؟ حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا ہے۔جب کوئی مادہ بناؤں گا، حساب سے درست نہ پاؤں گا۔'' (۳۸)

اصل میں غالب فن تاریخ گوئی کو پست درجے کا فن سمجھتے تھے۔میرزا تفتہ کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''فن تاریخ کو دون مرتبہء شاعری جانتا ہوں اور تمھاری طرح سے یہ بھی میرا عقیدہ نہیں ہے کہ تاریخ وفات لکھنے سے ادائے حق محبت ہوتا ہے۔'' (۳۹)

کسریٰ منہاس کا مقالہ بعنوان ''غالب کی تاریخ گوئی'' میں مقالہ نگار نے غالب کی چالیس تاریخیں درج کی ہیں جن میں اردو تاریخوں کی تعداد نو ہے۔وہ غالب کی تاریخ گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ ایک امر واقعہ ہے کہ سالم الاعداد تاریخیں غالب نے اتنی نہیں کہیں جتنی دوسری وضع کی جن کا تعلق قطعہ تاریخ کے محض ایک مصرعے سے نہیں ہے اور جن پر گمان کیا جا سکتا ہے کہ پورا قطعۂ تاریخ خود غالب نے ہی کہا ہوگا۔لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ غالب نے سالم الاعداد تاریخیں سرے ہی سے نہیں کہی ہیں۔اصل میں غالب نے ہر وضع کی تاریخ کہی ہے۔بعض صورتوں میں پورے ایک مصرع سے تاریخ برآمد ہوئی ہے۔بعض اوقات گھٹانے اور جوڑنے کے بیک وقت عمل سے تاریخ نکالی گئی ہے۔لہذا کوئی وجہ نہیں کہ ہم غالب کو تاریخ گوئی میں عاجز خیال کریں اور یہ سمجھیں کہ وہ اس بات کے محتاج تھے کہ مادۂ تاریخ ان کو کوئی نکال کر دے دے تو وہ تاریخ کہیں ورنہ نہ کہیں۔غالب کی تاریخوں کے مطالعے سے ہمیں کسی قسم کی بد گمانی نہیں ہوتی۔انھوں نے ہر قسم کی تاریخیں نکالی ہیں اور اپنی جدت فکر سے اس صنف سخن کو چار چاند لگائے ہیں۔'' (۴۰)

اصل میں غالب تاریخ گوئی کے فن کو اہمیت نہ دیتے تھے اور اسے ضمنی حیثیت دیتے تھے۔ان کا کبر نفس بھی پسند نہ کرتا تھا کہ وہ اس فن میں مشہور ہوں۔یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی انا یہ گوارا نہ کرتی ہو کہ تاریخ ادب میں اس کا نام تاریخ گوئی کے حوالے سے لیا جائے۔

غالب نے بارہا اپنی فارسی دانی اور فارسی شاعری پر فخر کیا ہے۔انھوں نے اشعار میں بھی اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میری فارسی شاعری ''نقش ہائے رنگ رنگ'' ہے اور مجموعۂ اردو ''بیرنگ'' ہے:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ　　بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منست

دوسری طرف دوستوں سے ریختہ کی داد دینے کے بھی طلب گار دکھائی دیتے ہیں۔ایک خط میں نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں :

''ایک بات تم کو یہ معلوم رہے کہ جب حضور میں حاضر ہوتا ہوں تو اکثر بادشاہ مجھ سے ریختہ طلب کرتے ہیں ،سو وہ کہی ہوئی غزلیں تو کیا پڑھوں،نئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں۔آج میں نے دوپہر کو ایک غزل لکھی ہے،کل یا پرسوں جا کر پڑھوں گا۔تم کو بھی لکھتا ہوں۔داد دینا کہ اگر ریختہ پایۂ سحر یا اعجاز کو پہنچے تو اس کی یہی صورت ہوگی یا کچھ اور شکل:

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے　　اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے (۴۱)

مولوی ضیاالدین خان ضیا دہلوی کو لکھتے ہیں کہ اردو میں عربی فارسی سے سوا مزا ہے:

''فارسی وعربی کو باہم ربط دے کر ایک اردو پیدا کیا۔سبحان اللہ،وہ زبان نکلی کہ نہ نری فارسی میں وہ مزا،نہ نری عربی میں وہ ذوق۔''(۴۲)

اسی طرح ریختہ کے بارے میں ایک خط میں بنی بخش حقیر سے استفسار کرتے نظر آتے ہیں:

''بھائی خدا کے واسطے غزل کی داد دینا۔اگر ریختہ یہ ہے تو میر و مرزا کیا کہتے تھے۔اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے۔صورت اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب شاہزدگان تیموریہ میں سے لکھنؤ سے یہ زمین لائے۔حضور نے خود بھی غزل کہی اور مجھے بھی حکم دیا۔سو میں حکم بجالایا اور غزل لکھی:

سب کہاں، کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں　　(۴۳)

ایک اردو شعر میں بھی اپنے کلام کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں

غالب میرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو　　پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پانو

اصل میں غالب کے ان متضاد بیانات میں ایک نفسیاتی الجھن مسطور نظر آتی ہے۔وہ محسوس کرتے تھے کہ میرے فن کی جو قدر ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوسکی شاید میرے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد میرے فن کی قدر ہو۔غالب اپنے معاصر شعرا،خاص طور پر ذوق کو اپنے مرتبہ کا شاعر نہیں مانتے تھے جبکہ ذوق کو استاد شہ کا مرتبہ حاصل تھا۔لہذا غالب کے اس اظہار میں معاصرانہ چشمک کو دخل حاصل ہے۔اپنی نا قدری پر ان کا دل دکھتا تھا لہذا وہ اردو کی بجائے فارسی شاعری میں پناہ ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔جب کبھی کوئی فارسی اور اردو شاعری کا ذکر کرتا ہے تو غالب کا مذکورہ فارسی شعر نقل کیا جاتا ہے۔یہ شعر غالب کے انیس ۱۹ اشعار پر مشتمل ایک قطعہ کا ہے۔اس قطعہ کا مطلع ہے:

اے　کہ در بزم　شہنشاہ سخن　ایں　گفتۂ
کے بہ پرگوئی فلاں در شعر ہم سنگ من است

اس قطعے کے بارے میں خلیق انجم لکھتے ہیں:

''اس قطعے کے تمام اشعار کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مخاطب کوئی ایسا شاعر ہے جو اردو میں شعر کہتا ہے اور اسے بادشاہ سے قربت حاصل ہے۔بظاہر ایسے شاعر ذوق ہی تھے۔''(۴۴)

سید حامد صاحب نے اپنے مضمون ''غالب کی فارسی غزل'' میں اس انیس اشعار کے قطعے کو ذہن میں رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''غالب نے اپنی اردو شاعری کو بے رنگ ٹھہرایا ہے۔ دراصل بات کا محل ذوق سے چشمک تھی۔ غالب کا دل اس فضیلت سے دکھا ہوا تھا جو استاد شہ کو دربار شاہی میں دی جاتی تھی۔ اپنی حق تلفی پر برہم ہو کر انہوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ شعر گوئی میں جو کچھ تمہارے لیے سرمایہء افتخار ہے میرے لیے باعث عار ہے۔۔۔ غالب نے اپنی اردو شاعری کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اسے غالب کی معاصرانہ چشمکوں اور قلعہ معلیٰ میں ذوق کو حاصل ہوئی عزت اور اہمیت کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ اگر ہم کہیں کہ غالب اپنی اردو شاعری کو فارسی شاعری کے مقابلے میں واقعی بے رنگ اور حقیر سمجھتے تھے تو یہ غالب کی سخن فہمی، شاعرانہ صلاحیت اور ان کی عقل کو گالی دینا ہے۔ وہ اپنی اردو شاعری کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ یہ انھوں نے اپنی اردو شاعری کے بارے میں کہا تھا

ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج　　میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

غالب کا ایک اور شعر سنیے

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی　　گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

جو شاعر اپنے کلام کو بے رنگ سمجھتا ہو، کیا وہ یہ شعر کہہ سکتا ہے؟'' (۴۵)

غالب ہمیشہ اپنی انا کے خول میں محصور رہا ہے۔ غالب کی انگلی ہمیشہ وقت کی نبض پر رہتی تھی۔ حالات کی تبدیلی کے ادراک میں وہ انتہائی زیرک تھے۔ وقت کی کروٹ سے پہلے ہی وہ اپنے آپ کو نئے تناظر میں ڈھال لیتے تھے۔ صورت حال تبدیل ہونے پر وہ اپنے قصائد کے ممدوحین کو بھی تبدیل کرتے رہتے تھے۔ ایک طرف صورت حال یہ ہے کہ امجد علی شاہ کے انتقال (۱۳ فروری ۱۸۴۷ء) کے بعد میکش نے غالب کو مشورہ دیا کہ جو قصیدہ انھوں نے امجد علی شاہ کی مدح میں لکھا تھا وہ واجد علی شاہ کے نام منسوب کر دیا جائے۔ غالب کو یہ مشورہ ناگوار گزرا۔ انھوں نے اس کے جواب میں نومبر ۱۸۴۸ء کو میکش کو لکھا:

''تم نے جو کچھ بطورِ اطلاع لکھا تھا وہ دلِ غم زدہ کے لیے باعثِ شادمانی ہوا لیکن جو کچھ میرے لیے بطریقِ حکم مرقوم تھا وہ میری سمجھ میں نہیں آیا اور اس سے میرے سودائی دل کو کسی قدر پریشانی ہوئی۔ میرا دیوان فارسی (مطبوعہ ۱۸۴۵ء دہلی سے مدارس اور حیدر آباد تک اور لاہور سے ہرات و شیراز تک پہنچ چکا ہے۔ شاہِ جنت آرام گاہ (امجد علی شاہ) کی مدح کا قصیدہ شادم کہ گردش سبزا کرد روزگار اس میں درج ہے اور ایک دنیا اس کو دیکھ چکی ہے۔ یہ ننگ اپنے اوپر کیسے روا رکھوں کہ اسے کسی دوسرے کے نام کر دوں۔'' (۴۶)

غالب کی خواہش تھی کہ ملکہ انگلستان کو ''دستنبو'' کے ساتھ قصیدہ بھی بھیجا جائے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ قصیدہ کتاب کے شروع میں چھپے اور اُوپر لکھا ہو ''قصیدہ در مدح جناب ملکہ انگلستان خلد اللہ ملکہا''۔ اس قصیدے کے بارے میں غالب نے حاتم علی مہر کے نام میں خط لکھا:

''میں نے حضرت ملکہ معظّمہ انگلستان کی مدح میں ایک قصیدہ ان دنوں میں لکھا ہے۔'' (۴۷)

اسی طرح غالب میاں دادخاں سیاح کو اگست یا ستمبر ۱۸۵۹ء میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔ ''دستنبو'' میں نے نذر کی، ''مہر نیم روز'' معلوم نہیں آپ کے پاس ہے یا نہیں۔ خلاصہ یہ کہ شعر کو مجھ سے

اور مجھ کو شعر سے ہرگز نسبت باقی نہیں رہی۔ اس فتنہ و فساد کے بعد ایک قصیدہ جو ''دستنبو'' میں ہے اور ایک قصیدہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی مدح میں اور ایک قصیدہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی مدح میں اور دو بیت کا ایک قطعہ اور ایک رباعی، اس نظم کے سوا اگر کچھ لکھا ہو تو مجھ سے قسم لیجیے۔'' (۴۸)

مذکورہ بالا خطوط میں غالب نے قصیدہ لکھنے کے بارے میں جو کہا ہے درست نہیں ہے۔ ملکہ معظمہ کی مدح میں قصیدے کے بارے میں تقریباً یہی باتیں غالب نے ۲۲ دسمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں منشی نبی بخش حقیر کو بھی لکھی تھیں کہ انھوں نے یہ قصیدہ انہی دنوں میں کہا ہے۔ اس کی پردہ کشائی کرتے ہوئے مالک رام لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ غالب نے یہ قصیدہ ۱۸۵۳ء میں بہادر شاہ ظفر کی طویل بیماری کے بعد غسل صحت کے موقع پر کہا تھا۔'' (۴۹)

غالب نے اس قصیدے میں سے کچھ اشعار نکال کر اور کچھ لفظی تبدیلیاں کر کے اسے ملکہ معظّمہ کی مدح میں کر دیا تھا۔ ساٹھ اشعار کے اس قصیدے کا مطلع ہے:

در روزگار ہا نتوانند شمار یافت   خود روزگار انچہ دریں روزگار یافت

خلیق انجم لکھتے ہیں کہ:

''مالک رام صاحب نے جب مطبوعہ کلیات غالب کا آزاد لائبریری علی گڑھ کے ایک قلمی نسخہ کلیات غالب سے موازنہ کیا تو معلوم ہوا کہ مطبوعہ نسخے میں پانچ قصیدے ایسے ہیں جن کے ممدوح پہلے بہادر شاہ ظفر تھے لیکن بعد کو غالب نے ان قصیدوں میں ضروری ترمیم و تنسیخ کر کے انھیں دوسرے ممدوحین سے منسوب کر دیا۔'' (۵۰)

اسی بیان سے ملتا جلتا بیان سید قدرت نقوی کا بھی ہے کہ:

''غالب نے کئی قصیدوں میں تبدیلی کر کے بعض انگریزوں کے نام کر دیئے تھے۔ گویا پرانے قصیدوں میں ترمیم و اضافہ کر کے نئے ممدوحین کے سامنے پیش کر دیا۔'' (۵۱)

''پنج آہنگ'' میں ایک خط شمس الامراء نائب والی حیدر آباد کے نام ہے۔ اسی خط کے بارے میں سید وزیر الحسن عابدی لکھتے ہیں:

''اس خط میں غالب نے کہا ہے کہ میں کم و بیش تیس سال سے فارسی میں شعر کہہ رہا ہوں۔ خط کے آخر میں جس قصیدے کے شروع کے دو شعر ہیں وہ وہی قصیدہ ہے جو کلیات میں ۵۶ واں ہے اور نواب وزیر محمد خان والئ ٹونک کی مدح میں ہے۔ دراصل یہ قصیدہ شمس الامراء کی مدح میں تھا، جس کے شروع کے مذکورہ دو شعر نکال کر ان کے بجائے پانچ شعر بڑھا کر قصیدہ دوسرے ممدوح کے نام کر دیا گیا۔ راقم کے پاس غالب کے ایک معاصر میر فرحت اللہ خاں (غلام علی خان وحشت کے والد) کی بیاض ہے جس میں انھوں نے صرف غالب کا فارسی کلام جمع کیا ہے۔ اس میں قصیدہ اپنی سابقہ اصلی صورت میں ہے۔ غالب کے دیوان فارسی، کتابت شدہ ۱۸۴۱ء میں بھی یہ قصیدہ ان الفاظ میں درج ہے۔ ''بعنوان روشنگری آئینہ سخن بہ چشمداشت قبول

ازشمس الامراءنواب محمد رفیع الدین خان بہادر نائب والئی حیدرآباد'' (۵۲)

اسی طرح وقت کے نئے تناظر میں غالب نے اپنے اشعار میں بھی ردوبدل کیا۔سفر کلکتہ میں، قیام لکھنو کے دوران گیارہ اشعار کی ایک غزل کہی تھی۔جس کا آخری شعر

لائی ہے معتمدالدولہ بہادر کی امید جادہ رہ، کشش کاف کرم ہے ہم کو

ہے مگر جب غالب کی معتمدالدولہ سے بگڑ گئی تو آخری شعر کے پہلے مصرع سے معتمدالدولہ کا نام نکال کر اسے مقطع کر دیا۔

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب جادہ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

قیام کلکتہ میں غالب نے ایک مثنوی لکھی تو اس کی تخلیق کے وقت اس کا نام ''آشتی نامہ'' رکھا لیکن بعد میں بدل کر ''بادمخالف'' رکھ دیا۔اسی طرح غالب نے بعد میں مثنوی میں ایک شعر کا اضافہ بھی کر دیا۔اس کے بارے میں خلیق انجم لکھتے ہیں:

''غالب کے مروجہ فارسی دیوان میں شامل مثنوی ''بادمخالف'' میں ایک شعر ہے:

آں کہ طے کردہ ایں مواقف را چہ شناسد قتیل و واقف را

(جس شخص نے (شاعری میں) یہ منزلیں طے کی ہوں وہ قتیل اور واقف کو کیا گردانے گا) دلچسپ بات یہ ہے کہ بادمخالف کی اولین روایت میں یہ شعر نہیں ہے۔۔۔وہ شعر جو مروجہ روایت میں ہے، یقین ہے کہ کلکتہ سے واپسی کے بعد بڑھایا گیا ہے۔'' (۵۳)

سرسید احمد خاں نے جس وقت ابوالفضل کی معرکہ آرا تصنیف ''آئین اکبری'' کی تدوین کر کے شائع کرنا چاہا تو غالب سے اس پر تقریظ لکھنے کی فرمائش کی۔یہ بات غالب کی سمجھ نہیں آئی کہ سرسید نے ''آئین اکبری'' کو مرتب کرنا کیوں ضروری سمجھا۔غالب کا خیال تھا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں حکومت، تہذیب وتمدن اور ایجادات کے ضمن میں جو آئین رائج کئے، ان کے مقابلے میں آئین اکبری کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔اب اگر ادب وانشا کے لحاظ سے دیکھا جائے تو غالب کے نزدیک ''آئین اکبری'' اس میزان میں بھی بہت سبک ٹھہرتی ہے۔غالب نے سرسید کی فرمائش پر ۳۸ ابیات پر مشتمل تقریظ لکھ تو دی لیکن سید احمد خان نے اس کو شاملِ کتاب نہ کیا۔اسی تقریظ میں ایک بیت ہے:

طرز تحریرش اگر گوئی خوش است

نے فزون از ہر چرمی جوئی خوش است

''اگر تم یہ کہو کہ اس کا طرز تحریر اچھا ہے تو وہ بھی کچھ ایسا اچھا نہیں۔''

اصل میں غالب خود آئین اکبری کے اسلوب کے مقلد تھے۔اس بارے میں ڈاکٹر عندلیب شادانی لکھتے ہیں:

''مرزا نے ''آئین اکبری'' کے ''طرز تحریر'' کی مذمت کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابوالفضل ہی نے انھیں راستہ دکھایا ہے اور انہوں نے آئین اکبری ہی کے ساز وسامان سے اپنا گھر (اسلوب پنج آہنگ) سجایا ہے۔ان پر تھوڑا سا پرچھانواں بیدل کا بھی پڑا ہے۔'' (۵۴)

ڈاکٹر عندلیب شادانی نے آئین اکبری کے اسلوب نگارش کی آٹھ اہم خصوصیات کو غالب کی پنج آہنگ میں بھی خوب تلاش کیا

ہے۔فاضل محقق نے دونوں تصانیف کا تقابلی موازنہ کیا ہے اور تقریباً دوسو کے قریب الفاظ کی مماثلت بھی دکھائی ہے۔اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

''مرزا غالب نے ابوالفضل کی جدت طرازی سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور ''آئین اکبری'' کی روش خاص کے بنیادی عناصر کو اپنی تحریر کی اساس ٹھہرایا ہے اور اس طرح اپنے لیے دوسروں سے ایک الگ راہ نکالی ہے۔لیکن بہر حال ان کا راہ نما ابوالفضل ہی ہے اور آئین اکبری ان کا چراغ ہدایت۔یہ بات الگ ہے کہ انھوں نے اپنی انانیت کی بنا پر ابوالفضل سے استفادے کا اعتراف نہیں کیا اور ابوالفضل کے ''طرز تحریر'' کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔''(۵۵)

غالب نے نواب کلب علی خاں کو ایک بلا ضرورت مشورہ دیا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ملکہ معظمہ سے بذریعہ گورنمنٹ اپنے لیے خطاب حاصل کریں۔نواب موصوف نے اس کا برا منایا اور غالب سے ان کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔باوجود ضعف و بیماری غالب ۱۸۶۵ء کے جشن کے لیے رام پور گئے تا کہ تلافی مکافات کی کوئی صورت پیدا ہو سکے۔مالک رام لکھتے ہیں:

''غالب نے نواب کو متاثر کرنے کے لیے غزل

دائم پڑا ترے در پر نہیں ہوں میں

اور

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا　　وہ دن گئے کہ کہتے تھے ''نوکر نہیں ہوں میں''

کو بدل کر اس طرح لکھ کر بھیجا

در پر امیر کلب علی خاں کے ہوں مقیم　　شائستہ گدائی ہر در نہیں ہوں میں

بوڑھا ہوا ہوں قابلِ خدمت نہیں ہوں میں　　خیرات خوار محض ہوں نوکر نہیں ہوں میں(۵۶)

قصائد کے ممدوحین کی تبدیلیاں اور دوسری تحریفات میں غالب کی مصلحت پسندی اور مطلب برآوری پوشیدہ ہے۔جو قصائد بار آور نہ ہو سکے یا ایسی نوبت ہی نہ آسکی ان کو دوسرے ممدوحین کے نام کر دیا۔لہذا یہاں بھی غالب کی انا مجروح نہیں ہوئی بلکہ یہ اقدام بھی تحفظِ انا کے ضمن میں تھا۔

حالی نے ''یادگار غالب'' میں مثنوی ''مسئلہ امتناعِ نظیر خاتم النبین'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ

''چوں کہ مولانا (فضل حق خیر آبادی) کو وہابیوں سے سخت مخالفت تھی۔انھوں نے مرزا پر نہایت اصرار کے ساتھ یہ فرمائش کی کہ فارسی میں وہابیوں کے خلاف ایک مثنوی لکھ دو۔۔۔۔لاچار مرزا نے ایک مثنوی، جو کہ ان کے کلیات میں مثنویات کے سلسلے میں چھٹی مثنوی ہے،لکھ کر مولانا کو سنائی۔''(۵۷)

حالی نے یہ بھی لکھا کہ مولانا کو مثنوی کا آخری شعر

در یکے عالم دو خاتم تا وا مجوے　　صد ہزار عالم و خاتم بگو لے

ناپسند آیا اور اسے نکالنے کے لیے اصرار کیا۔مرزا نے حکم کی تعمیل کی جو کچھ پہلے لکھ چکے تھے،اس کو اسی طرح رہنے دیا،مگر اس کے

آگے چند اشعار کا اضافہ کر کے مضمون پھیلا دیا۔ بعد میں آنے والے غالب کے معروف سوانح نگاروں بشمول مالک رام لکیر کے فقیر بن گئے اور حالی پر ہی اعتماد کر کے دھوکا کھاتے گئے۔ یوں غلطی در غلطی کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جو تقریباً تا حال جاری ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کا مولانا فضل حق خیر آبادی کی فرمائش سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ مثنوی ۱۸۵۲ء میں لکھی گئی اور اس وقت مولانا موصوف کے علمی حریف شاہ اسماعیل دہلوی کو فوت ہوئے اکیس سال گزر چکے تھے۔

نورالحسن راشد کاندھلوی نے اپنے مقالے میں اس مثنوی کی تحریر اور اشاعت کے سلسلے میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

''یہ مثنوی دراصل مولانا محمد سالم (خلف مولانا سلام اللہ بن مولانا شیخ الاسلام حقی) دہلوی کی تحریر کی ترجمانی اور اس کا منظوم فارسی پیرہن ہے جو بہادر شاہ ظفر کی تعمیل ارشاد میں شعبان یا رمضان المبارک ۱۲۶۸ھ جولائی ۱۸۵۲ء میں منظوم و مرتب ہوئی اور بہادر شاہ کی ہدایت کے مطابق مطبع سلطانی قلعہ معلیٰ شاہ جہاں آبادی (دہلی) سے اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ مولانا محمد سالم نے یہ تحریر بہادر شاہ ظفر کے حضور پیش کی اور اس مضمون کو فارسی میں نظم کرا دینے کی درخواست کی۔ بہادر شاہ ظفر نے یہ درخواست منظور فرمائی اور غالب کو جو اس وقت دربار سے وابستہ اور ''مہر نیم روز'' کی ترتیب میں مشغول تھے، اس خدمت پر مامور کیا۔ تعمیل ارشاد ہوئی اور غالب نے اس مضمون کو نظم کر کے بہادر شاہ کے ملاحظہ سے گزارا۔ بہادر شاہ کو یہ ترتیب اور ترجمانی بہت پسند آئی۔۔۔۔۔ بہادر شاہ نے اس کی فوراً طباعت کا حکم دیا۔ اسی ارشاد کی بجا آوری میں یہ مثنوی مطبع سلطانی سے کتابی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔'' (۵۸)

اس مثنوی کا پورا نام ''بیان نموداری شان و نبوت ولایت کہ در حقیقت پرتو نورالانوار الوہیت است'' ہے اور عام طور پر مثنوی شان بنوت ولایت کے نام سے معروف ہے۔ ابتدا میں جب یہ مثنوی نظم ہوئی تو ایک سو ایک (۱۰۱) اشعار پر مشتمل تھی بعد میں کہیں غالب نے اس کے آخری تین شعر حذف کر کے تیس (۳۰) اشعار کا اضافہ کر دیا۔ حالی نے (جیسا کہ متذکرہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے) لکھا ہے کہ آخر کے تیس اشعار بڑھانے میں مولوی فضل حق کا ہاتھ ہے، درست نہیں ہے۔ اس بارے میں کالی داس گپتا لکھتے ہیں:

''مثنوی کی روایت اول کے ۱۰۱ اشعار میں سے تین شعر حذف کر کے تیس (۳۰) شعر بڑھانے کا عمل اگر مولانا فضل حق خیر آبادی کی شہ پر روا رکھا گیا ہو تو ہو۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳ اشعار قلم زد کرنے اور ۳۰ اشعار کا اضافہ کرنے میں بھی مولانا فضل حق خیر آبادی کا ہاتھ نہیں کیوں کہ ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر دہلی واپس انگریزی فوج کے قبضے میں آیا۔ گویا ۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء تک جب کہ بہادر شاہ ظفر شہنشاہ ہندوستان تھا، غالب سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ شعر:

بردعاے شہ سخن کوتاہ باد   تا خدا باشد بہادر شاہ باد

مثنوی سے خارج کر دیا جائے۔ پھر یہ بھی تو دیکھئے کہ اگست ۱۸۵۲ء اور ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کے درمیان فضل حق خیر آبادی دہلی میں رہے ہی نہیں تھے۔ وہ رام پور میں آٹھ سال رہ کر ۱۸۴۷ء میں یہیں سے لکھنو چلے گئے اور شاہ اودھ کی معزولی تک مختلف عہدوں پر فائز رہے۔۔۔ یہ شعر ''بردعاے شہ۔۔۔ دیوان غالب

فارسی مطبوعہ ۱۸۴۵ء (مثنوی سرمہ بینش) میں شامل ہے۔ لہذا قابل غور بات یہ ہے کہ ۱۸۴۵ء کا چھپا ہوا یہ شعر ۱۸۵۲ء کی مثنوی میں کیوں شامل کیا گیا۔ میری رائے میں غالب نے مولانا محمد سالم کی تحریر کا منظوم ترجمہ دل جمعی سے نہیں کیا تھا۔ اس میں شاہ کی مدح میں پہلے ہی کا کہا ہوا شعر آخر میں چسپاں کر کے فراغت پالی مگر جب اکتوبر ۱۸۵۸ء میں بہادر شاہ ظفر کو جلاوطن کر دیا گیا تو غالب نے خود یا کسی کے کہنے پر اس مثنوی پر نظر ثانی کی اور تین شعر حذف کر کے اور تیس شعر بڑھا کر پوری مثنوی ہتھیالی۔ پھر کسی توضیح کے بغیر اپنے کلیات فارسی مطبوعہ ۱۸۶۳ء میں شامل کر لی''۔(۵۹)

غالب کو ۱۸۴۷ء میں جوئے کے الزام میں قید ہوئی اور بقول حالی غالب کی اسیری برائے نام تھی اور قید خانے میں انہیں ہر طرح کی سہولتیں میسر تھیں۔ غالب نے بھی اپنے ایک فارسی خط میں تفضل حسین خاں کو اپنی قید کے حوالے سے حالی سے ملتا جلتا انداز ہی اپنایا ہے۔ لکھتے ہیں:

''۔۔۔پھر نہ معلوم کیا ہوا کہ جب (قید کی) ساری معیاد ختم ہونے کو آئی تو مجسٹریٹ کا دل پسیجا اور اس نے صدر عدالت سے خود اپنے حکم کی تنسیخ اور میری رہائی کی درخواست کی۔ درخواست منظور ہوئی بلکہ اس کی اس خواہش کی تعریف کی گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ سرآوردگان قوم نے اس سر پھرے یعنی ناانصاف مجسٹریٹ کو ملامت کیا اور میری آزادہ روی اور خاکساری اس پر واضح کی۔ (اور یہ سب) اس طور پر کہ (بالآخر) اس نے میری رہائی کی درخواست خود ہی کی، معذرت (بھی) کی اور اس کے علاوہ بھی معافی، تلافی اور دل جوئیاں کرتا رہا۔۔۔''(۶۰)

اصل میں اسیری کی سبکی سے غالب کا دل دکھا ہوا تھا۔ بدنامی کے اس داغ کو دور کرنے اور اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے غالب نے دوران قید ''حبسیہ'' بھی لکھا اور اس میں ان کی انا پھر سر اٹھانے لگی۔ اس ضمن میں بھی غالب نے ''حبسیہ'' میں مبالغے سے کام لیا ہے اور ''جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے'' والا انداز اپنایا ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ بقول پروفیسر خواجہ احمد فاروقی:

''غالب جوئے کے الزام میں قید ہوئے تو حب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مجرم کی نہیں بلکہ بادشاہ کی سواری اس زندان خانہ میں داخل ہو رہی ہے۔'' (۶۱)

غالب کی اسیری کے بارے میں انیس ناگی لکھتے ہیں:

''غالب کی بیان کردہ تفاصیل متضاد بلکہ مضحکہ خیز بھی ہیں۔ وہ اس موقف پر مُصر تھے کی قمار بازی کا قصہ محض غلط فہمی کی بنا پر ہوا اور انہیں سہواً سزا دی گئی۔ اپنی اسیری کے بعد غالب اس کی تفصیل میں دانستہ طور پر اخفا برتتے رہے ہیں۔ گھنشام داس عاصی کی معاصر شہادت غالب کے اس بیان سے مختلف ہے۔ عاصی کے مطابق جیل میں برے حال تھے۔ ان کی صحت بگڑ چکی تھی۔ کپڑوں میں جوئیں پڑ چکی تھیں۔ ان کی حالت زار دیکھ کر سول سرجن نے طبی بنیادوں پر غالب کی قبل از وقت رہائی کی سفارش کی تھی۔''(۶۲)

اس بارے میں حالی کے بیان پر تنقید کرتے ہوئے انیس ناگی لکھتے ہیں کہ غالب کو قید بامشقت ہوئی تھی۔ غالب کے حبسیہ سے گمان گزرتا ہے کہ غالب سے رسیاں بٹوانے کی مشقت بھی لی گئی تھی اور ان کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا تھا۔

غدر ۱۸۵۷ء میں انگریز حکام نے غالب سے بھی پوچھ گچھ کی۔ اس بارے میں غالب اپنی تصنیف ''دستنبو'' میں لکھتے ہیں:

> ''راجہ نرندر سنگھ کے سپاہی کا روکنا بے سودر ہا (گورے) دوسرے چھوٹے مکانوں کو نظر انداز کر کے جہاں راقم الحروف تھا، آ پہنچے۔ اپنی خوبی مزاج کے سبب گھر کے اسباب کو چھوا تک نہیں اور مجھے ان دونوں مبارک شکل بچوں، دو تین نوکروں اور چند نیک کردار پڑوسیوں کے ساتھ پکڑ آئے گئے اور چھوڑ دیا گلی سے دو فرلانگ سے کچھ زیادہ فاصلے پر اور وہ بھی درشتی یا سخت گیری کے ساتھ نہیں، معاملہ فہم اور دانش مند کرنیل براؤن بہادر کے سامنے، جو چوک اس طرف، قطب الدین سوداگر کے مکان میں ٹھہرا ہوا ہے، مجھے لے گئے۔ کرنل نے میرے ساتھ نرمی سے بات کی اور مجھ سے نام اور دوسروں سے پیشہ پوچھا اور خوش نودی کے ساتھ اسی وقت گھر کو رخصت کر دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا، اس خجستہ خو کو آفریں کہی اور واپس آ گیا۔'' (۶۳)

حقیقت یہ ہے کہ غالب کو ابتدا میں خیال آیا ہو یا نہ آیا ہو لیکن ''دستنبو'' کی اشاعت سے قبل ان کے ذہن میں یہ خیال ضرور پیدا ہو چکا تھا کہ ''دستنبو'' کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے۔ خصوصاً اپنی بے گناہی اور اس وسیلے (دستنبو) سے پنشن کی بحالی کے لیے انہوں نے اس تالیف میں مصلحت سے کام لیا۔ لہٰذا انہوں نے اس موقع پر بھی ان (انگریز حکام) کو ''اپنی خوبیٔ مزاج''، ''معاملہ فہم''، ''دانش مند'' اور ''خجستہ خو'' کہا ہے۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اس بارے میں قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

> ''غلام حسین خاں نے اپنی فارسی کتاب میں جس کا ملخص ترجمہ ''غدر کا نتیجہ'' کے نام سے شائع ہوا ہے، لکھا ہے کہ گورے غالب کو گرفتار کر کے کرنیل برن (کذا) کے پاس لے گئے، مرزا کی زندگی ابھی باقی تھی، ان کے ایک دوست اتفاق سے وہاں بیٹھے تھے، انہوں نے ان کی سفارش کر کے رہائی دلوادی'' (۶۴)

غالب نے انقلاب کے دوران مصلحت پسندی کا رویہ اپنائے رکھا اور حالات پر نظر رکھی کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ انہوں نے غدر ۱۸۵۷ء کے حوالے سے نو اشعار کا ایک قطعہ بھی لکھا جس کا پہلا شعر ہے:

بس کہ فعال ما یرید ہے آج ہر سلحشور انگلستان کا!

محققینِ غالب کی اکثریت نے اس قطعہ کو غالب کی حب الوطنی کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اور یہ ہے بھی حقیقت کہ غالب کے دل میں حب الوطنی کا جذبہ موجود تھا۔ لیکن وہ حالات کی بے یقینی اور اس کے جبر سے مجبور بھی تھے۔ اس انتہائی نازک وقت میں ان کا رویہ ایک مصلحت پسند کا رہا تھا۔ لہٰذا غالب کو یہ قطعہ کم از کم پانچ سال بعد منظرِ عام پر لانا پڑا۔ بقول ڈاکٹر۔ ظ۔ انصاری:

> ''غدر کے فرو ہو جانے کے بعد ۱۸۶۱ء میں ان کا دیوان اردو شائع ہوا تو اس میں یہ قطعہ شامل نہ تھا جو ۱۸۵۷ء میں لکھا گیا تھا۔'' (۶۵)

''دستنبو'' میں غالب نے ہر ممکن طریقے سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاہانِ تیموریہ سے ان کا تعلق برائے نام تھا اور وہ بھی محض تاریخ نویسی تک محدود تھا۔ حالانکہ ''مہر نیم روز'' میں غالب نے خود اپنے آپ کو شاہانِ تیموریہ کے خاندان سے منسلک کیا ہے۔ اپنی پیرانہ

سالی اور ضعیفی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ناچار ہفتے ایک دو بار قلعے جاتا اور اگر بادشاہ محل سے باہر آتا تو کچھ دیر خدمت میں کھڑا رہتا ورنہ دیوان خاص میں تھوڑی دیر بیٹھتا اور آتا اور جتنا کچھ اس دوران میں لکھ لیا ہوتا اپنے ساتھ لے جاتا یا کسی کے ہاتھ بھیج دیتا۔ میں (ادھر) اس مصروفیات میں تھا اور (ادہر) چرخ تیز رفتار دور رس خیال میں کہ ایک نئے انقلاب کا خاکہ مرتب کرے اور (میرا) یہ بے حقیقت سا آرام واطمینان جو ہر قسم کی آلودگی سے مبرا تھا برباد کردے۔'' (۶۶)

اصل میں غالب اس تالیف کے ذریعے حکام کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ بادشاہ سے ان کا کوئی خاص تعلق نہ تھا وہ تو انگریز کے پنشن خوار اور خیر خواہ تھے۔ لیکن دوسری طرف غالب بہادر شاہ ظفر سے بھی تعلقات استوار کئے ہوئے تھے۔ اس بارے میں غالب خطوط میں بھی اپنی بے گناہی کو ظاہر کرتے رہے ہیں۔ لیکن بقول پروفیسر خواجہ احمد فاروقی:

''لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ انہوں نے بہادر شاہ کی خدمت میں سکہ بھی پیش کیا تھا اور فتح آگرہ کی خوشی میں ایک قصیدہ بھی پڑھا تھا۔ اس لیے ان کی بے گناہی کو بعض نئی شہادتوں کی روشنی میں قبول نہیں کیا جاسکتا۔'' (۶۷)

خلیق انجم نے لکھا ہے کہ غالب نے دوران انقلاب تین قصیدے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں کہے تھے۔ ایک ۲۶ مئی ۱۸۵۷ء کو عید کے موقع پر دوسرا ۱۳، جولائی ۱۸۵۷ء کو آگرہ کی فتح کی خوشی کے موقع پر، اور تیسرا ۱۱ اگست ۱۸۵۷ء کو۔ غدر کے موضوع پر تبصرہ کرتے ہوئے انیس ناگی نے بالکل درست تجزیہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اصل میں غالب کا ۱۸۵۷ء کے بارے میں رویہ اس عہد کے ایک مصلحت پسند کا تھا جو بیک وقت انگریزوں اور انقلابیوں سے ڈرتا تھا اور کسی ایک کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ غالب انگریز حکومت کی مہربانیوں کے بارے میں رطب اللسان ہیں اس کے باوجود غیر شعوری طور پر ان کی بربریت بھی بیان کرتے ہیں۔'' (۶۸)

غدر میں غالب کے بھائی مرزا یوسف کو ایک انگریز سپاہی نے ۱۱۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو قتل کر دیا۔ غالب نے اس واقعہ کو بھی پردہ اخفا میں رکھنے کی کوشش کی اور اپنی تصنیف ''دستنبو'' میں اس کی وفات کو طبعی ظاہر کیا۔ لکھتے ہیں:

''۱۱۹ اکتوبر کو وہی پیر کا دن، جس کا نام ہفتے کے دنوں کی فہرست سے کاٹ دینا چاہیے، ایک سانس میں آتش فشاں اژدہے کی طرح دنیا کو نگل گیا، اس دن کے پہلے پہر میں وہ افسردہ رُو، ژولیدہ مُو دربان، بھائی کے مرنے کی بدخبری لایا۔ کہتا کہ وہ گرم رفتار راہِ فنا پانچ دن تک تیز بخار میں جلتا رہا اور رات کے وقت آدھی بجے توسنِ (عمر) کو اس تنگنائے سے کود الے گیا۔'' (۶۹)

اس ضمن میں مالک رام نے بھی ''خدنگ غدر'' کے مصنف معین الدین حسن خان کا بیان لکھا ہے کہ:

''میرزا یوسف خان کہ قدیم سے مجنوں تھے، گھر سے باہر نکل کر ٹہلنے لگے وہ بھی مارے گئے۔'' (۷۰)

غالب کو پنشن کی بازیابی کی جتنی فکر تھی اس سے زیادہ خلعت و دربار کی واگزاری کی خواہش تھی۔ غالب کے سوانح نگاروں بالخصوص

غلام رسول مہر نے واشگاف الفاظ میں لکھا ہے کہ ۱۸۶۳ء میں پنشن کے ساتھ ساتھ خلعت و دربار بھی واگزار ہو گئے۔لیکن حالات و واقعات سے اس بیان کی صحت مشکوک سی ہو جاتی ہے۔غالب کو کلکتے میں بھی خلعت و دربار کی فکر لاحق تھی۔انہوں نے ۱۵ فروری ۱۸۶۷ء کو محمد حبیب اللہ ذکا کو بھی لکھا کہ کلکتہ گیا،نواب گورنر سے ملنے کی درخواست کی،دفتر دیکھا گیا،میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا،ملازمت ہوئی۔سات پارچے اور جیغہ ءسر پیچ اور مالائے مروارید یہ تین رقم خلعت ملا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کو خلعت نہیں ملا۔یہ صرف ان کی آرزو تھی۔مالک رام نے ''ذکر غالب'' میں ''دربار و خلعت کی بحالی'' کے عنوان سے لکھا ہے کہ:

''بارے یہ کوشش پروان چڑھیں اور ۳ مارچ ۱۸۶۳ء کو دربار و خلعت بھی پھر سے جاری ہو گیا۔''(۷۱)

غالب ایک جگہ خط میں لکھتے ہیں کہ لارڈ صاحب یہاں آئے اور اہل دفتر نے اطلاع دی کہ تمھارا دربار و خلعت واگزاشت ہو گیا۔مگر دلی میں دربار نہیں،انبالے جاؤ گے۔دوسری جگہ منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں کہ لارڈ الگن گورنر جنرل کے دربارِ انبالہ کی خبر اور اس میں شمولیت کی صلاح خود سر رابرٹ منٹگمری نے دی تھی۔غالب پھر اپریل ۱۸۶۳ء کو تفتہ کو لکھتے ہیں:

''ہم نے لفٹنٹ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت کر کے،انبالے کا جانا موقوف کیا اور بڑے گورنر کا دربار اور خلعت اور وقت پر موقوف رکھا۔'' (۷۲)

غالب نے تفتہ کو یہ بھی لکھا کہ ''سامان سفر انبالہ و مصارف بے انتہا کہاں سے لاؤں اور طرہ یہ کہ نذر معمولی میری قصیدہ ہے''۔دوسری طرف انبالے نہ جانے کی وجہ بیان کرتے ہوئے میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں:

''رجب کے مہینے میں سیدھے ہاتھ پر ایک پھنسی ہوئی۔پھنسی پھوڑا ہو گئی،پھوڑا پھوٹ کر زخم بنا۔زخم بگڑ کر غار ہو گیا۔اب بقدر یک کفِ دست وہ گوشت مردار ہو گیا۔انبالے نہ جانے کی بھی یہی وجہ ہوئی''۔(۷۳)

غالب نے ایک خط اودھ اخبار کو بھی لکھا جس میں ۱۸۶۳ء کو لفٹنٹ گورنر بہادر قلم رو پنجاب کے دہلی آنے اور غالب کو یاد فرمانے کا تذکرہ کیا ہے۔اخبار مذکور میں خط سے پہلے منشی نول کشور کی یہ تحریر بھی درج ہے اور قریب بہ یقین ہے کہ یہ تحریر بھی خود غالب نے لکھ کر بھیجی تھی۔تحریر ملاحظہ ہو:

''قدر دانی حکام۔بخت مند ہر زمانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔اہل جوہر تعظیم و توقیر کو انتخاب ہوتے ہیں۔دیکھیے،ان دنوں میں سرکار نے کیسی مہربانی کی۔کمال کی قدر دانی کی۔نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مرزا اسد اللہ خاں کو خلعت فاخرہ عطا فرمایا اور رئیس نوازی کی نظر سے بہ دل التفات کر کے ہم چشموں کو ان کا اعزاز و اکرام دکھایا۔زیادہ احتیاج بیاں ہے۔ان کے خط سے یہ حال عیاں ہے''۔(۷۴)

یہ تحریر مکمل طور پر غالب کے اسلوب بیاں کی غماز ہے۔اس کا مقصد ہم چشموں کو نیچا دکھانا اور ان کی زبان بندی کرنا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ غالب کو استادشہ ہونا مہنگا پڑا۔سرکاری پنشن تو کسی طرح ۱۸۶۰ء میں بحال ہو گئی لیکن گورنر جنرل بہادر کے دربار سے خلعت اور لمبر بحال نہ ہو سکا۔اس بارے میں ممتاز حسین لکھتے ہیں:

''غالب اپنے دوستوں کو رابرٹ منٹگمری کی زبانی گفتگو کے حوالے سے جو اس ''مژدہ جانفزا'' کا حال لکھتے

رہے ہیں وہ بے بنیاد تھا۔معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ دوستوں سے اپنی سبکی چھپانے کے لئے ایسا لکھتے رہے ۔جس خلعت کے لئے غالب اس قدر مشتاق تھے کہ اس کی پیروی وہ ایک گدائے مبرم کی طرح کرتے رہے،اس خلعت کے ملنے کی خبر پا کر وہ انبالے نہ جائیں یہ بات کچھ قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتی ۔معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ مژدہ جانفزا غالب کے تخیل کا پروردہ تھا۔ ہمارے اس خیال کو مزید تقویت اس بات سے بھی پہنچتی ہے کہ جب سر ڈانل میکلوڈ گورنر پنجاب نے اپنا دربار ۱۳ جنوری ۱۸۶۶ء میں کیا ہے تو اس موقع پر غالب کو نشست بہت ہی نچلی صف میں دی گئی تھی ۔اس ذلت اور خواری کو انہوں نے اپنے قصیدے میں بیان کیا ہے اور میکلوڈ صاحب سے درخواست کی ہے کہ وہ اس سبکی اور بے عزتی کا مداوا کریں۔ یہ قصیدہ دیوان غالب نسخہ عرشی میں موجود ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

سب صورتیں بدل گئی ناگاہ یک قلم — لمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام
ستر برس کی عمر میں یہ داغ جانگداز — جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام
تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں — استادہ ہو گئے لب دریا پہ جب خیام
اس بزم پُرفروغ میں اس تیرہ بخت کو — لمبر ملا نشیب میں از روئے اہتمام
سمجھا اسے گراپ، ہوا پاش پاش دل — دربار میں مجھ پہ چلی چشمک عوام
عزت پہ اہلِ نام کی ہستی کی ہے بنا — عزت جہاں گئی تو نہ ہستی رہی نہ نام
تھا ایک گونہ ناز جوانے کمال پر — اس ناز کا فلک نے لے لیا مجھ سے انتقام
امر جدید کا تو نہیں ہے مجھے سوال — بارے قدیم قاعدے کا چاہیے قیام
ہے بندے کو اعادۂ عزت کی آرزو — چاہی اگر حضور تو مشکل نہیں یہ کام

۔۔۔۱۸۶۶ء تک کی تو یہ روداد ہے۔اگر واقعتاً ان کو معمولی خلعت اور لمبر بڑے لارڈ صاحب کا واگزشت کیا گیا ہوتا تو پھر یہ سبکی میکلوڈ صاحب لفٹنٹ گورنر پنجاب کی طرف سے کیونکر معرض وجود میں آتی ۔قرائن اور شواہد تو سارے یہی بتاتے ہیں کہ ان کا رتبہ پہلے سے بھی کم کر دیا اور گورنر جنرل یا وائسرے ہند کے دربار سے معمولی خلعت واگزاشت نہ ہوا۔''(۷۵)

غالب اپنی بعض تصانیف کے انطباع کے وقت اخبارات میں منظوم اور نثری اشتہارات بھی دوسروں لوگوں کے نام سے بھیجا کرتے تھے۔ایک اشتہار جو ''پنج آہنگ'' کی طباعت کے حوالے سے ہے،اسعدالاخبار آگرہ میں ۱۲ مارچ ۱۸۴۹ء کو شائع ہوا۔اشتہار کچھ یوں ہے:

''نقل اشتہار منظوم طبع پنج آہنگ مصنفہء حضرت مرزا اسداللہ خاں صاحب بہادر غالب، جو اپریل میں قیمت بھیج دے تین روپے اور جو بعد اس کے بھیجے چار روپے دینے پڑیں گے۔

مژدہ اے رہروانِ راہ سخن — پایہ سنجانِ دستگاہِ سخن

طے کرو راہِ شوق زود زود | آن پہنچی ہے منزلِ مقصود
پاس ہے اب سوادِ اعظمِ نثر | دیکھیے چل کے نظم عالمِ نثر
سب کو اس کا سواد ارزانی | چشمِ بینش ہو جس سے نورانی
ہے یہ وہ گلشن ہمیشہ بہار | بارور جس کا سرو، گل بے خار
اس سے اندازِ شوکتِ تحریر | اخذ کرتا ہے آسماں کا دبیر
تھے ظہوری و عرفی و طالب | اپنے اپنے زمانے میں غالب
نہ ظہوری ہے اور نہ طالب ہے | اسداللہ خاں غالب ہے
اس سے جو کوئی بہرہ ور ہوگا | سینہ گنجینۂ گہر ہوگا
میں جو ہوں درپئے حصولِ شرف | نام عالی کا ہے غلام نجف

مخفی نہ رہے کہ یہ اشتہار دہلی سے بہ سبیل ڈاک میرے ایک مخدوم والا شان نے واسطے درج کرنے اخبار کے میرے پاس بھیجا ہے۔''(۷۶)

مذکورہ بالا منظوم اشتہار ۳۳ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہاں صرف چیدہ چیدہ اشعار کو نقل کیا گیا ہے جو بندش الفاظ اور انداز بیاں سے غالب کے فن کی غمازی کر رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ شاعرانہ تعلّی کسی شاعر کو ہی سوجھ سکتی ہے اور زیب دیتی ہے۔ غیر کے اندر کسی دوسرے کے لیے ایسا جذبہ پیدا ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ منظوم اشتہار غالب کا زائیدہ طبع ہے۔ غالب نے اپنے خط بنام نواب علی بہادر مسند نشیں باندہ میں لکھا ہے کہ:

''اگر پنج آہنگ میری تصنیف نہ ہوتی تو کہتا کہ یہ کتاب فارسی کے لیے ''قانون'' کا حکم رکھتی ہے اور دقیق و نازک نکات، نادر ترکیبوں اور فصیح و شیریں الفاظ کا قیمتی ذخیرہ ہے۔''(۷۷)

قاضی عبدالودود نے یہ اشتہار اپنی کتاب ''مآثر غالب'' میں درج کیا ہے اور تعلیقات میں بجا طور پر لکھا ہے کہ:

''قرائن سے واضح ہے کہ یہ اشتہار خود غالب کا نظم کردہ ہے، اگرچہ غلام نجف خاں کی طرف سے ہے جو غالب کے شاگرد تھے۔''(۷۸)

اودھ اخبار لکھنو کی اشاعت مورخہ یکم جنوری ۱۸۶۶ء میں ''اشتہار طبع کلیات نظم جناب میرزا غالب دہلوی'' چھپا ہے۔ یہ اشتہار نہایت قافیہ دار نثر میں تخلیق کیا گیا ہے۔ جملے مقفع اور مسجع ہیں۔ قریب بہ یقین ہے کہ یہ نثری اشتہار غالب کا زائیدہ طبع ہے کیونکہ اس تحریر میں غالب کے ذہنی و فکری رجحانات کی عکاسی نظر آتی ہے۔ اسی اخبار کی اشاعت ۱۲ مارچ ۱۸۶۲ء میں ایک تحریر بعنوان ''نواب میرزا اسداللہ خاں غالب'' چھپی ہے۔ جس میں غالب کی تعریف کی گئی ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریر بھی غالب کی ہی ہے کیونکہ اس میں جس طرح پنشن کا ذکر، انگریز حکام کی تعریف اور ملکہء وکٹوریہ کی مدح کا ذکر کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسے خود غالب نے لکھ بھیجا تھا۔'' قاطع برہان'' کے مباحثے میں لکھنو کی ادبی فضا میں بھی ہل چل مچ گئی اور اس مباحثے میں ''زہرہ و مشتری'' نے بھی حصہ لیا جس کا ذکر درگاہ پرشاد نادر کے تذکرے ''تذکرہ النساء'' میں آیا ہے۔ غالب کی حمایت میں نور محمد خان عطارد نامی شخص نے ''اشرف الاخبار'' کو ایک مضمون لکھ کر بھیجا

تھا۔اس تحریر کا انداز بھی بعینہ غالب جیسا ہے۔کیونکہ زہرہ ومشتری کا منہ عطارد ہی بند کرسکتا تھا اس لیے فرضی عطارد نامی شخص تخلیق کیا گیا جس طرح قتیل کی ''چہار شربت'' پر غالب کی ''پنج آہنگ'' عددی حیثیت سے غالب ہے۔اس تحریر کے بارے میں نثار احمد فاروقی نے لکھا ہے کہ:

''میرا خیال ہے کہ مراسلہ نگار کا یہ نام 'نور محمد خاں عطارد فرضی ہے۔عجب نہیں کہ یہ خط خود غالب نے لکھ کر بھیجا ہو یا اپنے کسی شاگرد سے بھجوایا ہو۔''(۷۹)

اسی طرح غالب نے اپنی تصنیف ''لطائف غیبی'' خود لکھ کر سیاح کے نام سے چھپوائی بلکہ بقول شیخ محمد اکرام کبھی کبھی وہ سیاح کے نام سے اعتراضات، اخباروں میں چھپواتے تھے اور سیاح کو اس کی اطلاع، اعتراض چھپ جانے کے بعد ہوتی تھی۔اصل میں غالب کے اس طرح کے اعمال میں ایک نفسیاتی گرہ پائی جاتی ہے اور وہ ہے ان کا حد سے بڑا ہوا پندار اور کبرِ نفس۔مولانا عبدالمجید سالک ''لطائف غیبی'' کے بارے میں اسی حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مرزا غالب نے خود یہ رسالہ لکھا اور نام سیاح کا کر دیا۔وجہ یہی کہ وہ خود منشی سعادت علی کے مقابلے پر آنا کسرِ شان سمجھتے تھے۔لہذا ایک شاگرد کو آگے کر دیا اور محمد حسین دکنی کے حامی کو ایک دکنی سے ہی جواب دلوایا۔'' (۸۰)

غالب ''لطائف غیبی'' کی اشاعت کے بعد سیاح کو لکھتے ہیں:

''یہ جو میں نے ''سیف الحق'' خطاب دیا ہے، اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔تم میرے ہاتھ ہو، تم میرے بازو ہو۔میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ چلتی رہے گی۔''لطائف غیبی'' نے اعدا کی دھجیاں اڑا دیں۔'' (۸۱)

''لطائف غیبی'' کی طباعت کے اخراجات خود غالب نے برداشت کئے۔لیکن ان کا کبرِ نفس اس چیز کو گوارا نہ کرتا تھا کہ دوسروں کو اس کا علم ہو۔جو بھی اس ضمن میں ان سے استفسار کرتا غالب یہی کہتے کہ مطبع والوں نے خود چھاپی ہے۔ایک خط میں سیاح کو لکھتے ہیں:

''صاحب میں نے اپنے صرف زر سے ''لطائف غیبی'' کی جلدیں نہیں چھپوائیں۔مالک مطبع نے اپنی بکری کو چھاپیں۔''(۸۲)

''سوالات عبدالکریم'' کے خاتمے کی عبارت بھی غالب کے اسی ''کبرِ نفس'' پر روشنی ڈالتی ہے۔

''نجم الدولہ اسداللہ خاں بہادر غالب، امیر نامدار اور مع ہذا حلیم اور بردبار ہیں۔۔۔۔۔میں نے ایک دن نواب صاحب محتشم الیہ سے پوچھا کہ آپ نے منشی سعادت علی صاحب کی بدزبانی کا جواب کیوں نہ دیا۔حضرت نے فرمایا کہ اگر راہ چلتے سڑک پر گدھا تم کو لات مار بیٹھے تو کیا تم بسبیل تلافی سڑک پر ٹھہر جاؤ گے اور گدھے کو لات مارو گے؟ میں نے کہا کہ ہرگز نہیں۔حضرت نے ارشاد کیا کہ پھر میں منشی کی خرافات کا جواب کیا دوں۔اس امر کے اظہار سے میری عرض یہ ہے کہ حضرت غالب تمھارے مقابلے کو ننگ وعار سمجھ کر سکوت کر گئے۔۔۔۔'' (۸۳)

غالب ''تیغ تیز'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ اگر میری طرف سے ازالہء حیثیت کی نالش دائر ہو جاتی تو میاں پر کیسی بنتی؟ مگر

میرے کبرِنفس نے ازالۂ حیثیت کے لفظ کو گوارا نہ کیا۔ان کی تحریران کے پاجی پن پر سجل ہے، بہ مہر ذرہ تا آفتاب۔لیکن پھر ''تیغ تیز'' کے انطباع کے بعد غالب نے امین الدین پر ازالہء حیثیت عرفی کا مقدمہ چلا دیا اور جب آخر میں ناکامی کے آثار نظر آنے لگے تو مقدمہ واپس بھی لے لیا۔کیونکہ ان کی انا مقدمہ میں ناکامی کو بھی گوارا نہ کر سکتی تھی۔

غالب ''محرق قاطع برہان'' کا خاکہ اڑانے چاہتے تھے لیکن ان کی خواہش کہ یہ کام اپنے عزیزوں اور مداحوں سے انجام پائے۔لہذا اس کام کے لئے غالب کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی مدد کی۔اس بارے میں سید معین الرحمٰن لکھتے ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے کہ خود غالب ''محرق'' کی غلطیاں جمع کر رہے تھے، نیر رخشاں نے بھی یہ کام اپنے ذمے لیا تھا، علائی سے بھی انہوں نے مدد چاہی تھی، قدر بلگرامی کو بھی اس کے لیے ابھارنا چاہا تھا، سیاح نے بھی حسبِ توفیق اس کار خیر میں ہاتھ بٹایا اور حصہ لیا ہوگا۔مختلف اربابِ نظر، اپنے اپنے اندازے کے مطابق جو جو غلطیاں بروئے کار لائے غالب نے باضابطہ مطالب دیگر، انہیں حلیہ عبارت سے آراستہ و پیراستہ کیا اور یوں ''لطائف غیبی'' عالم وجود میں آئی۔'' (۸۴)

مذہب کے بارے میں بھی غالب کے ہاں متضاد بیانات ملتے ہیں۔بعد میں اس مسئلے کو مولانا الطاف حسین حالی کے بیانات نے لاینحل بنا دیا۔ممکن ہے اگر حالی مرزا غالب کے مذہب کو نہ چھیڑتے تو یہ معاملہ اتنا طول نہ پکڑتا۔لیکن حالی کے بعد محققینِ غالب تا حال اس مسئلے میں الجھے ہوئے ہیں اور غالب کے مذہب کو کھینچ تان کر اپنے اپنے مسلک کے مطابق ڈھالنے میں کوشاں ہیں اور اب تک اس بارے میں متفقہ اور دوٹوک فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں۔اصل میں غالب چونکہ وسیع المشرب تھے اس لیے ہر فرقہ یہی سمجھتا تھا کہ وہ ان کے ہم مسلک ہیں۔دوسرے غالب کے متضاد بیانات اس مسئلے کو مزید الجھا دیتے ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں بھی وہ اپنے مفاد کے پیش نظر مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف مذہبی رویہ رکھتے تھے۔مثلاً غالب نے اہل تشیع دوستوں کے نام خطوط میں اثنا عشری حیدری لکھا ہے اور مقصد صرف اور صرف ان کی ہمدردیاں سمیٹنا تھا۔غالب نے میر غلام حسین قدر بلگرامی کو خط میں آخر میں لکھا ''اثنا عشری حیدری''۔اس بارے میں سید معین الرحمٰن'' لطائف غیبی'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''اثنا عشری حیدری'' کے اعلان کی غایت ''استحصال وانگیخت'' ہے، ورنہ اس سے پہلے یا اس کے بعد غالب نے قدر بلگرامی کے نام اپنے کسی خط میں، اپنے نام کے ساتھ ''اثنا عشری حیدری'' کے ایزاد کی ضرورت نہیں سمجھی۔''(۸۵)

اسی طرح غالب حاتم علی میر کو لکھتے ہیں:

> ''صاحب بندہ اثنا عشری ہوں۔ہر مطلب کے خاتمے پر بارہ کا ہندسہ کرتا ہوں۔خدا کرے کہ میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو، ہم تو ایک آقا کے غلام ہیں۔''(۸۶)

دوسری طرف میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

> ''میاں لڑکے سنو! میر نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد اعظم صاحب کی، وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے اور میں مرید ہوں اس خاندان کا۔۔۔صوفی صافی ہوں اور حضراتِ صوفیہ حفظِ مراتب ملحوظ رکھتے ہیں۔''(۸۷)

اسی طرح میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں:

''اگر منظور کیجیے تو میں صوفی ہوں۔ ہمہ اوست کا دم بھرتا ہوں۔''(۸۸)

حالی نے لکھا ہے کہ جس وقت مرزا نے قاطع برہان لکھی ہے نہ اس وقت ان کے پاس ایک قلمی برہان کے سوا کوئی فرہنگ ولغات تھی، اور نہ کوئی ایسا سامان موجود تھا جس پر تحقیق لغت کی بنیاد رکھی جاتی۔ یہاں حالی سے تسامح ہوا ہے کیونکہ غالب خود عالم مارہروی کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ اس درماندگی کے دنوں میں چھاپے کی برہان قاطع میرے پاس تھی۔ اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ھزارھا لغت غلط، ھزارھا بیان لغو، عبارت پوچ، اشارت پادرہوا۔

اس موضوع پر پروفیسر محمد باقر نے خوب دادِ تحقیق دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ برھان کے مطبوعہ نسخوں میں سب سے پہلا نسخہ وہ ہے جو لارڈ ھیسٹنگز (۱۸۲۳ء-۱۸۱۳ء) کے عہد میں جولائی ۱۸۱۸ء میلادی میں کلکتے سے شائع ہوا تھا۔ اسے مشہور مستشرق کپتان ٹامس روبک نے سید کرم حسین الحسینی بلگرامی کے مقدمے کے ساتھ اور متعدد علما اور ۳۴ کتابوں سے مراجعہ اور برھان کے تیرہ خطی نسخوں سے مقابلے کے بعد شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۲۲ء میں کلکتے سے شائع ہوا اور تیسرا ۱۸۳۴ء میں حکیم عبدالمجید نے چھاپا اور علما کے تعاون سے شائع کیا اور غالب کے اپنے بیان کے مطابق قاطع برہان لکھتے وقت یہی نسخہ ان کے سامنے تھا۔ غالب نے متعدد مقامات پر اس نسخے کے صفحات کے حوالے بھی دیے ہیں۔ اس ضمن میں وہ مزید لکھتے ہیں:

> ''امتیاز علی خاں عرشی نے کتاب خانہ رضا رامپور سے برہان کا ایک مطبوعہ نسخہ ڈھونڈ نکالا ہے جو ان کے بیان کے مطابق افضل المطابع کلکتہ میں ۱۲۵۱ھ، ۱۸۳۶ء میں بڑے سائز کے ۹۲۴ صفحات پر چھپا تھا اور جس پر غالب نے برہان کی اغلاط کی نشان دہی کی ہے۔ یہ نسخہ غالب نے یکم اگست ۱۸۵۸ء کو علاؤالدین خان علائی کے تحفہ دے دیا تھا۔ چنانچہ یہ نوابان لوھارو کے کتاب خانے میں محفوظ رہا اور جب یہ کتاب خانہ رام پور منتقل ہوا تو یہ نسخہ بھی وہاں پہنچ گیا۔''(۸۹)

پروفیسر محمد باقر لکھتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ برھان کے ۱۸۳۴ء کے مطبوعہ نسخے کے علاوہ یہ دوسرا نسخہ تھا جو غالب کے زیرِ مطالعہ رہا۔ لیکن ایک آدھ مقام پر مجھے یہ شبہ بھی ہوا ہے کہ غالب کے پاس ان دونوں نسخوں کے علاوہ کوئی اور نسخہ بھی موجود تھا۔ کیونکہ اُس نے برہان میں شائع ہونے والی مہمل ترکیب ''ماھو چی شمۂ خضر'' پر تنقید کی ہے وہ برھان کے ۱۸۳۴ء کے مطبوعہ نسخے میں صحیح طور پر یوں درج ہے ''ماھی و چشمۂ خضر'': کنایہ از زبان و دھان معشوق است''۔

پروفیسر موصوف لکھتے ہیں کہ:

> ''ظاہر ہے کہ غالب اگر اس کنایہ اور اس کے معانی کو صحیح طور پر چھپا ہوا دیکھتا تو اسے اعتراض کی ضرورت اور گنجائش نظر نہ آتی۔ میرے پاس برھان کے جو متعدد مطبوعہ نسخے ہیں، ان میں ''ماھی و چشمہء خضر'' صحیح طور پر درج ہے۔ لیکن مولانا غلام رسول مہر صاحب کے پاس برھان کا ایک مطبوعہ نسخہ موجود ہے جو ۱۲۷۳ قمری میں کلکتے سے شائع ہوا ہے۔ مہر صاحب کی کمک سے یہ راز کھلا کہ اس کے صفحہ ۲۵۴ پر
>
> ''ماھی و چشمہء خضر''

اشتباھاً چھپا ہوا ہے اور غالب کا ایراد درست ہے۔ کیونکہ اس کے پاس کوئی تیسرا نسخہ بھی تھا جس میں یہ اسی طرح درج تھا۔"(۹۰)

اصل میں غالب کے مذکورہ بالا بیان کو قاطع برھان کے قضیہ کے پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ خط میں غالب نے بطور صفائی لکھا ہے کہ میرے پاس صرف چھاپے کی برھان قاطع موجود تھی تا کہ کسی طور اس شور شر انگیز میں کمی واقع ہو۔

مذکورہ بالا غالب کے تمام بیانات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کی سیرت اور کردار مثالی نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب اپنی انا کو تحفظ دینے کی غرض سے ایسا برتاؤ کرتے رہے ہیں اور ساتھ ہی ان کی مجبوریاں بھی تھیں۔ وہ مسائل کے حل کی سبیل میں تضاد بیانیوں سے بھی کام لیتے رہے۔ غالب کی دوہری اور بٹی ہوئی شخصیت کے حوالے سے ڈاکٹر تحسین فراقی نے درست تجزیہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"غالب کی شخصیت میں کش مکش دراصل اسی سبب سے پیدا ہوتی ہے کہ نظری اعتبار سے تو وہ ہستی اشیاء کو محض وہم سمجھتے ہیں لیکن عملاً انہی اشیاء کی طلب میں پریشان رہتے ہیں، چنانچہ وہ آپ کا بندہ اور پھروں ننگا، آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار جیسے قطعات کہنے، بہادر شاہ ظفر کو خوش کرنے اور انگریز وائسرائے وغیرہ تو ایک طرف ادنیٰ انگریز اہل کاروں تک کے قصیدے پڑھنے پر مجبور ہیں، شوپنہار نے شاید درست کہا تھا کہ نامیاتی زندگی اس چھڑی سے مماثل ہے جسے ہاتھ پر متوازن رکھنے کے لیے اس کو مستقلاً گھمانا ضروری ہے۔"(۹۱)

اسی حوالے سے محمد موسیٰ کلیم لکھتے ہیں کہ:

"لوگ اس خوشامدانہ روش کو اس کے کردار کی کمزوری بتلاتے ہیں اور اسے حقیر سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ کوئی کمزوری نہیں بلکہ اثباتِ ذات کا ایک منفی ہتھیار ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اس ہتھیار کے استعمال سے غالب نے اپنی ادبی شخصیت کو زندہ سلامت رکھا۔"(۹۲)

غالب خود بھی اپنی شخصیت کے اس پہلو سے آگاہ تھے۔ جو کچھ انہوں نے کیا وہ یقیناً کسی نہ کسی مجبوری کے تحت تھا وہ خود کلیات نظم فارسی کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ انصاف بالائے طاعت یہ ہے کہ جو کچھ بالاخوانی اور خودستائی میں نے شعر کے ذریعہ کی ہے۔ اس کا نصف حصہ "شاہد بازاری" اور نصف حصہ "تونگری ستائی" سے تعلق رکھتا ہے۔ میں اس آزادی سے خوش ہوں کہ زیادہ تر اشعار عشق بازوں کے طور طریقے (بہ ہنجار عشق بازاں) پر کہے گئے ہیں اور اس حرص و آز سے میرا سینہ داغ داغ ہے جس کے تحت میں نے دنیا طلبوں کی طرح چند اوراق اہل جاہ کی ستائش میں سیاہ کئے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا، غالب کا ذوق تماشہ، لاہور: اقبال اکیڈمی پاکستان، ۱۹۹۷ء، ص ۸۲۔۸۳

۲۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط، (جلد چہارم) نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۳ء، ص ۱۵۳۷

۳۔ اظہار الحق ملک، غالب کے خود نوشت حالات، مشمولہ "احوال غالب" (مرتب) ڈاکٹر مختار الدین احمد، دہلی: مکتبہ جامعہ

لمٹیڈ، جون ۱۹۵۳ء، ص ۲۷

۴۔ قاضی عبدالودود، جہاں غالب، پٹنہ: خدابخش اورئینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۵ء، ص ۲۵۰

۵۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، غالب اور آہنگ غالب، نئی دہلی، غالب اکیڈمی، ۱۹۷۱ء، ص ۷۰

۶۔ کالی داس گپتا رضا، غالب درون خانہ، بمبئی: ساکار پبلشرز پرائیوٹ لمٹیڈ، دسمبر ۱۹۸۹ء، ص ۲۳

۷۔ ایضاً، حاشیہ، ص ۱۶

۸۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد چہارم) محولہ بالا ۲، ص ۱۵۳۷

۹۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، غالب اور آہنگ غالب، محولہ بالا ۵، ص ۴۷

۱۰۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد چہارم) محولہ بالا ۲، ص ۱۵۳۷

۱۱۔ کالی داس گپتا رضا، غالب درون خانہ، محولہ بالا ۶، ص ۱۲

۱۲۔ امتیاز علی عرشی، دیوان غالب (نسخہ عرشی) علی گڑھ: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۸ء، دیباچہ ص ۳

۱۳۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد سوم) نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۷ء، ص ۱۰۷۳

۱۴۔ امتیاز علی عرشی، دیوان غالب (نسخہ عرشی) محولہ بالا ۱۲، ص ۱۳، ۱۴

۱۵۔ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش (مرتب) اردو میں اصول تحقیق (جلد دوم) اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء ص ۱۸۷

۱۶۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف، غالب، سید معین الدین قریشی (مترجم) نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۲۰۰۲ء ص ۴۱

۱۷۔ پرتو روہیلہ (مترجم) نامہ ہائے فارسی غالب، ترتیب متن فارسی، سید اکبر علی ترمذی، کراچی: ادارہ یادگار غالب ۱۹۹۹ء، ص ۱۵۵، ۱۵۶

۱۸۔ مالک رام، ذکر غالب (کچھ نئے حالات) مطبوعہ، افکار، غالب نمبر، فروری، مارچ ۱۹۶۹ء (شمارہ ۲۱۱۔۲۱۰) ص ۵۱

۱۹۔ ایضاً، حاشیہ، ص ۵۱

۲۰۔ ڈاکٹر ابومحمد سحر، غالبیات اور ہم، نئی دہلی: تخلیق کار پبلشرز، ۱۹۹۴ء ص ۶۷

۲۱۔ مولانا الطاف حسین حالی، یادگار غالب، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۷ء، ص ۲۸

۲۲۔ پرتو روہیلہ (مترجم) نامہ ہائے فارسی غالب، محولہ بالا ۱۷، ص ۶۴

۲۳۔ مالک رام، ذکر غالب، لاہور: مکتبہ شعر و ادب، سمن آباد، ۱۹۷۵ء ص ۶۰۔۶۱

۲۴۔ خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، پاکستان: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۵ء ص ۳۶

۲۵۔ پرتو روہیلہ (مترجم) نامہ ہائے فارسی غالب، محولہ بالا ۱۷، ص ۷۰

۲۶۔ ایضاً ص ۷۳

۲۷۔ مالک رام، ذکر غالب، محولہ بالا ۲۳، ص ۶۶

۲۸۔ قاضی عبدالودود، کچھ غالب کے بارے میں (حصہ ۲) پٹنہ: خدابخش اورئینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۵ء، ص ۵۳۹

۲۹۔ خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، محولہ بالا ۲۴، ص ۴۷

۳۰۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری، غالب اور عصر غالب (غالب پر چند تحقیقی مقالات) کراچی: غضنفر اکیڈمی، ۱۹۹۵ء ص ۳۹۔۴۰

۳۱۔ خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، محولہ بالا ۲۴، ص ۴۷

۳۲۔ پرتو روہیلہ (مترجم) نامہ ہائے فارسی غالب، محولہ بالا ۱۷، ص ۱۰۸

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۵۸

۳۴۔ خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، محولہ بالا ۲۴، ص ۱۷۳

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۷۴

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۷۴

۳۷۔ ایضا، ص ۱۷۴

۳۸۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد دوم) نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۵ء، ص ۵۴۸

۳۹۔ ڈاکٹر اکبر حیدری، غالبیات کے چند فراموش گوشے، ''مرزا غالب کی تاریخ گوئی'' (مضمون)، کراچی: ادارہ یادگار غالب ۲۰۰۲ء، ص ۱۸۰

۴۰۔ کسری منہاس، غالب کی تاریخ گوئی (مضمون) مشمولہ صحیفہ، غالب نمبر، فروری ۱۹۶۹ء ص ۸۳

۴۱۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد سوم) محولہ بالا ۱۳، ص ۱۱۰۵

۴۲۔ خلیق انجم: غالب کے خطوط (جلد دوم) محولہ بالا ۳۸، ص ۷۴۵

۴۳۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد سوم) محولہ بالا ۱۳، ص ۱۱۱۳

۴۴۔ خلیق انجم (مرتب) غالب۔ کچھ مضامین، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۹۱ء، ص ۶

۴۵۔ ایضاً، ص ۶

۴۶۔ ڈاکٹر اکبر حیدری، غالبیات کے چند فراموش گوشے، محولہ بالا ۳۹، ص ۳۹

۴۷۔ خلیق انجم: غالب کے خطوط (جلد دوم) محولہ بالا ۳۸، ص ۷۰۴

۴۸۔ ایضاً ص ۶۰۱

۴۹۔ مالک رام، غالب کے فارسی قصیدے (مضمون) نقوش، لاہور، مارچ ۱۹۶۳ء، ص ۲۳

۵۰۔ خلیق انجم، غالب اور شاہان تیموریہ، دہلی: اردو اکیڈمی، ۱۹۷۲ء، ص ۶۱

۵۱۔ سید قدرت نقوی، غالب کون ہے؟ ملتان: امروز پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۸ء، ص ۲۰

۵۲۔ میرزا اسداللہ خاں غالب: پنج آہنگ، تدوین و تصحیح و تحقیق، سید وزیر الحسن عابدی، لاہور: مطبوعات مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء، ص ۶۷۳

۵۳۔ خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، محولہ بالا ۲۴، ص ۱۶۸

۵۴۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی ''مرزا غالب کا اسلوب نگارش (پنج آہنگ میں) مشمولہ (ارمغان ایران) مرتبہ، ڈاکٹر وحید قریشی، مجلس ترقی ادب، لاہور، اکتوبر، ۱۹۷۱ء، ص ۷۰

۵۵۔ ایضاً ص۔۷۱

۵۶۔ مالک رام، غالب اور دربار رام پور، (مضمون) مشمولہ غالب نام آور م: سہ ماہی ''اردو'' کے مضامین کا انتخاب کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۹ء ص ۳۷

۵۷۔ مولانا الطاف حسین حالی، یادگار غالب، محولہ بالا ۲۱، ص ۷۰۔۷۱

۵۸۔ عبدالعزیز ساحر، ''غالب گمان سے یقین تک'' مشمولہ ''بازیافت'' جولائی تا دسمبر ۲۰۰۳ شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج لاہور، ص ۲۳۷، ۲۳۸

۵۹۔ کالی داس گپتا رضا، غالب کی بعض تصانیف، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان ۲۰۰۲ء، ص ۱۸، ۱۹

۶۰۔ پرتو روہیلہ (مرتب و مترجم) باغ دو در میں شامل غالب کے فارسی خطوط کا اردو ترجمہ، اسلام آباد: بزم علم و فن پاکستان، ۲۰۰۰ء، ص ۶۴

۶۱۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، یادو بود غالب، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۳ء، ص ۴۵

۶۲۔ انیس ناگی، غالب پریشان، لاہور: مکتبہ جمالیات، ۱۹۹۳ء ص ۱۶۴۔۱۶۵

۶۳۔ اسداللہ خاں غالب، دستنبو، مخمور سعیدی (مترجم) کراچی: الکتاب، اگست ۱۹۶۹ء، ص ۵۴۔۵۵

۶۴۔ قاضی عبدالودود، جہان غالب، محولہ بالا ۴، ص ۶۴

۶۵۔ ڈاکٹر۔ظ۔انصاری، غالب کی کہانی (مضمون) شاعر، بمبئی، غالب نمبر، ۱۹۶۹ء ص ۵۹۷

۶۶۔ اسداللہ خاں غالب، دستنبو، مخمور سعیدی (مترجم) محولہ بالا، ۶۳ ص ۴۳

۶۷۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، یادگار غالب، محولہ بالا ۶۱، ص ۱۳۹

۶۸۔ انیس ناگی، غالب پریشان، محولہ بالا ۶۲ ص ۱۶۵

۶۹۔ اسداللہ خاں غالب، دستنبو، مخمور سعیدی (مترجم) محولہ بالا ۶۳، ص ۸۹۔۹۰

۷۰۔ مالک رام، ذکر غالب، محولہ بالا ۲۳ حاشیہ، ص ۱۰۳

۷۱۔ ایضاً ص ۱۱۹

۷۲۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد اول) نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۳ء ص ۳۴۰

۷۳۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد دوم) محولہ بالا ۳۸ ص ۶۲۷

۷۴۔ ڈاکٹر اکبر حیدری، نوادر غالب، ''غالب اور اودھ اخبار'' (مضمون) کراچی: ادارہ یادگار غالب، ۲۰۰۲ء ص ۴۰

۷۵۔ ممتاز حسین، غالب۔ایک مطالعہ، کراچی: انجمن ترقی اردو، اشاعت اول ۱۹۶۹ء، ص ۷۴۔۷۶

۷۶۔ اکبر علی خاں، ''غالب اپنے معاصر اخبارات میں'' (مضمون) نقوش غالب ۱۹۶۹ء، ص ۶۴۲

۷۷۔ محمد عمر مہاجر، پنج آہنگ (آہنگ پنجم) غالب کے فارسی خطوط کا ترجمہ، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۹ء، ص ۱۸۵

۷۸۔ میرزا اسداللہ خاں غالب: پنج آہنگ۔ تدوین و نو و تصحیح و تحقیق۔ سید وزیر الحسن عابدی، محولہ بالا ۵۲، ص ۱۰۷

۷۹۔ نثار احمد فاروقی، تلاش غالب، لاہور: کتابیات، ۱۹۶۹ء، ص ۸۲

۸۰۔ سید معین الرحمٰن (مرتب) لطائف غیبی، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۸۲

۸۱۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد دوم) محولہ بالا ۳۸، ص ۵۷۰

۸۲۔ ایضاً، ص ۵۶۲

۸۳۔ سید معین الرحمٰن (مرتب) لطائف غیبی، محولہ بالا ۸۰، ص ۴۳

۸۴۔ ایضاً، ص ۲۱

۸۵۔ ایضاً، حاشیہ ص ۱۸۔۱۹

۸۶۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد دوم) محولہ بالا ۳۸، ص ۷۰۶، ۷۰۷

۸۷۔ ایضاً، ص ۴۹۹

۸۸۔ ایضاً، ص ۷۶۳

۸۹۔ نجم الدولہ مرزا اسداللہ خاں بہادر غالب، درفش کاویانی، باھتمام پروفیسر محمد باقر، لاہور: مطبوعات مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء، ص ۲۵

۹۰۔ ایضاً، ص ۲۶

۹۱۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، غالب۔ فکر و فرہنگ، لاہور: اردو اکیڈمی پاکستان، ۲۰۰۱ء، ص ۱۸

۹۲۔ محمد موسیٰ کلیم، مقامِ غالب، لاہور: جدید ناشرین، اردو بازار، ۱۹۶۵ء، ص ۸۱